عطیہ چودھری محمد علی صاحب - استاد جامعہ

آفتاب

اسلام اور اسلامی مفکرین

مرتبہ

خورشید الاسلام

صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی

اسلام کے نام

جو اِک زندہ طاقت ہی

فہرست مضامین

"پیش لفظ"

دنیا کی موجودہ کیفیت | "یہ دنیا جو بظاہر اتنی حسین، رنگا رنگ اور انوکھی ہے۔ نہ اس میں محبت ہے نہ خوشی، اور نہ روشنی، نہ اس میں سکون ہے نہ یقین ہے نہ درد کی دوا اور ہم یہاں اس طرح ہیں جیسے کسی گھٹا ٹوپ تاریک میدان میں، جہاں رات کے پردے میں جاہل فوجیں باہم دست و گریباں ہوں پراگندہ خطرات سے دوچار اور فرار کے لئے بے چین"۔

(آرنلڈ)

یہ الفاظ اس قابل تو نہیں کہ جلوس آدم کا ترانہ بن سکیں البتہ اس قابل ضرور ہیں کہ انہیں ہماری تاریخ کے سرورق پر جگہ دی جائے۔ نہ کہنے کو علم کے جادو بھی جگائے گئے، عمل کے دریا بھی کھنگالے گئے، حسن کی پرستش بھی کی گئی اور یہ کارواں اس قلۂ کوہ کی طرف بڑھتا رہا جہاں سے شہنائی کی آواز آ رہی تھی لیکن انسان زندگی گذارنا نہ سیکھا۔

رجحانات | فرد نے ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے راگ گائے، خانہ بدوشوں نے جیتی جاگتی تہذیبوں کو تہ تیغ کیا اور کہیں کہیں آتشِ قدس جلا کر انسان نے اپنے نفس اور اجتماعی نفس سے گذر کر سیمرغ کی طرح چنگل بڑھا کر ستارے توڑنے کی کوشش کی، علم اشیا پھلا پھولا، علم نفس کی نشو و نما ہوئی اور جب انسان نے خشت و سنگ سے عمارتیں تعمیر کرنا سیکھیں تو اسے یہ جاننے کی ضرورت بھی ہوئی کہ اس کی دیوار تلے کون رہتا ہے؟ -

انسانی خودی کی کہانی سردیاں گئیں اور برساتیں آئیں، دن بیتے اور راتیں آئیں، کبھی میلاد ہوا کبھی موت ہوئی کبھی غم کے بادل آئے کبھی اُمید کا ساون آیا، کبھی کامیابی کا شامیانہ تنا، کبھی ناکامیوں کا سامنا ہوا۔ کبھی خواب و خور کی فراوانی رہی کبھی جنگ و جدال کی پریشانی، غرض انسان کی خودی کبھی دکھ سے روئی کبھی پھولوں سے کھیلی، کبھی اس نے مرثیہ پڑھا کبھی رجز کہا، کبھی بستیوں میں کھو گئی اور کبھی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر سورج کی کرنوں کا تماشا دیکھتی رہی۔ کبھی ہاتھ میں پتوار لے کر کشتی کو گرداب میں ڈال دیا۔ کبھی ہاتھوں سے پتوار چھوٹی اور موجوں میں غرق ہو گئی اور ہاں کبھی کبھی چنگ لئے دریا کنارے عشق پیچاں کی نازک شاخوں سے کھیلتی رہی۔

علوم کی انتہا یہ سب کچھ ہوا اور اس طرح ایک روح دوسری روح کو، ایک انسان دوسرے انسان کو، ایک ضمیر دوسرے ضمیر کو آواز دیتا رہا۔ جس طرح ستار کے تار مختلف آوازیں پیدا کرتے ہیں اور یہ آوازیں مشرق و مغرب سے اٹھ کر ایک حسین نغمہ پیدا کرتی ہیں اور یہ نغمہ تار و چوب سے نکل کر دل کو آواز دیتا ہے اور ایک بار انسان کو محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اَن دیکھا حسین سونے کے ترنج لہروں پہ بہار ہا ہے اسی طرح یہ سب روحیں، یہ سب ضمیر، یہ سب انسان مشرق اور مغرب سے، دامن کوہ اور سطح مرغزار سے اپنے اپنے حسن اور اپنے اپنے جذبے کے ساتھ پکارتے رہے ہیں اور یہ زیر و بم ایک نغمے میں حل ہو کر کسی بت گر کے کانوں تک پہنچ رہا ہے شاید اُسے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہو کہ انسان نے اس کے ربط کو بیکار نہیں رہنے دیا ہے۔ کس قدر دل آرام ہے یہ احساس کہ "ہر بچہ جو اس دنیا میں آتا ہے خدا کا یہ پیغام ساتھ لاتا ہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا ہے۔"

(ٹیگور)

عقلی کوششوں کے نتائج | لیکن شاید انسان اپنی کوششوں سے مایوس ہو چلا ہے، ابن آدم اس بچے کی طرح ہے جو اپنی ماں کا دامن پکڑے تماشہ دیکھنے گیا ہو اور شام نے اپنی نقاب بھی نہ اٹھائی ہو کہ باد و گرد کے طوفان میں بھٹک گیا ہو، جس کی کہنیوں سے خون ٹپک رہا ہو، جس کے ماتھے پر گرد جمی ہو، اور جو امید کی ہر کرن سے مایوس سر کف دست پر رکھے خاموش بیٹھا ہو جس کی زبان سے آہ نکلتی ہو لیکن اس کے سوا کوئی سننے والا نہ ہو جو آسودگی چاہتا ہو لیکن ہر جگہ تضاد اور کشمکش سے دوچار ہوتا ہو، جو حسن چاہتا ہو لیکن ہر منظر بدنمائی لئے ہوئے ہو، جو صحت چاہتا ہو۔ لیکن ہر چہار سو بیماریاں بال بکھرائے کھڑی ہوں جو جاننا چاہتا ہو لیکن عقل احساس اور وجدان کی جنگ ہر مطلع کو کہرآلود کر دیتی ہو جو آسمانی روشنی کی طرف دوڑتا ہو لیکن جبہ و دستار درمیان میں کوہ الوند بنکر آجاتے ہوں۔ اس اندھیری فضا میں کبھی جگنو چلکتا ہو کبھی گہن میں آجاتا ہو کبھی کبھی جنت کے کلس دکھائی دیتے ہوں اور کبھی چند لمحوں میں موم کے مجسمے کی طرح پگھل جاتے ہوں کبھی جھیل کے کنارے ایک منادی پکارتا ہو اور کبھی مصر، یونان اور روم کے دیوتا اپنے قہقہوں میں آسمانی آواز کو ڈبو دیتے ہوں اور یہ بچہ کبھی اس آواز کی سمت دوڑتا ہو اور کبھی اُس آواز کی طرف . . . . اور جب کچھ نہ پاتا ہو تو تھک کر بیٹھ جاتا ہو۔

"پرندے اپنے آشیانے رکھتے ہیں لیکن ابن آدم کے لئے سر چھپانے کو جگہ نہیں"! (حضرت مسیحؑ)

زندگی کی تفسیریں اور ہم | یہ ناؤ ہچکولے کھاتی چلی آئی ہے اور ہچکولے کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اس ناؤ میں پیغمبر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں شاعر بھی ہیں اور محض عملی انسان بھی؛ اِن سب کو

کچھ نہ کچھ کہنے کا شوق ہے بعض کو دردمندی سے اور بعض کو صرف گرمیٔ بزم کے لئے لیکن سب کی باتیں مختلف ہیں۔ پیغمبر کے علاوہ سب دماغوں کی تصویریں اور سب ہاتھوں کے نقوش نامناسب ہیں لیکن ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ اس نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دی ہے ہم انہی میں سے کسی مبالغہ آمیز تصویر کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور سو رنگ میں متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھ کر دنیا پر قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ اور آسمانوں سے پرے پرواز کرتے ہیں کبھی اپنے آپ کو مجبورِ محض پا کر خطائیں کرتے ہیں اور قدرت کو اپنی عدالت میں ملزم قرار دیتے ہیں .... کبھی ہمیں اپنی بات پر کامل یقین ہوتا ہے اور مذاقِ عمل مہلت نہیں دیتا کہ ہم ایک گوشے میں بیٹھ کر یہ سوچ لیں کہ ہم سب کہاں جا رہے ہیں۔ انسان ہجوم میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے خواہ منزلِ مقصود آگ کے مینارے ہی کیوں نہ ہوں۔ کبھی ہمیں اپنے آپ پر بھی شک ہونے لگتا ہے اور خیام کی طرح درخیام کے ساتھ مکتب کے دلائل سے مایوس ہو کر اپنی قبا شراب میں ڈبو دیتے ہیں۔ ایک زمانہ آتا ہے کہ ہم دنیا کو دیکھ کر لب آسا ہنستے ہیں اور وہ وقت بھی آتا ہے جب ہر نظارے کو دیکھ کر چشم آسا رونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام کیفیات محض کیفیات نہیں رہتیں۔ یہ روح کی داستان سہی مگر یہ محض داستان نہیں ہے۔ ہماری مادی زندگی اور اس کی تمام گلکاریاں انہی حسیات کا عکس ہوتی ہیں۔ جدا جدا انفرادی زندگیاں ہی نہیں۔ قریوں اور قوموں کی زندگیاں ایک مخصوص نفسیاتی شعور پر تعمیر ہوتی ہیں زندگی کا ایک نظام، اچھائی اور برائی کا ایک معیار جمالیاتی نقطۂ نظر، فنی اصول، سیاست کے نقشے، غرض ہماری تاریخ اور ہماری آرزوئیں اسی خاک سے اٹھتی ہیں۔

زندگی کی الہامی تفسیر | زندگی کا وہ نظریہ جس میں سائنٹفک حقیقت بھی ہے شعری حسن بھی ہے اور عمل کی آگ بھی، یعنی جس میں زندگی کے مختلف عناصر اس طرح سموئے گئے ہیں کہ کسی طرح جدا نہیں کئے جاسکتے۔ اسلام کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ فطرت انسانی کے دھارے کے بہاؤ کے عین مطابق ہے۔ ہر مذہب اس بڑے انسانی تجربے کے لئے جو ہزاروں برس سے زماں و مکاں کی بندشوں میں ہو رہا ہے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے مذہب محض عقائد کا مجموعہ ہوتا ہے نہ محض کرامات کی پھلجڑی نئے سے قربانیوں کا بندھا ٹکا دستور کہا جاسکتا ہے! اور نہ اندرون خانہ مقید کیا جاسکتا ہے.... یہ تو ایک بہتی ہوئی بڑھتی ہوئی اور چھاتی ہوئی چیز ہے جو ہماری زندگی کے ہر گوشے اور اس نقش کے ہر پہلو پر محیط ہے، زندگی کا ہر نظام یقین سے شروع ہوتا ہے۔ خواہ وہ یقین یہ ہو کہ "خیال وجود سے پہلے ہے" یا یہ کہ "وجود خیال سے پہلے ہے" خدا ہے یا خدا نہیں ہے ان دونوں باتوں کا جواب انسانی دماغ نہیں انسانی وجدان اور قوتِ ایقان دے سکتی ہے۔

مذہب کی بنیادیں (الف) مذہب کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ اس زماں و مکاں سے دور اس مٹی کے تانے بانے سے آگے۔ ان حیوانات، جمادات اور نباتات کے اوپر ان دریاؤں اور پہاڑوں سے ماورا اور ان سب میں ایک عظیم الشان روح ایک زبردست قوت جاری و ساری ہے۔ وہ روح جس میں زندگی ہے لیکن اضمحلال نہیں، جس میں طاقت ہے لیکن ظلم نہیں، جس میں نور ہے لیکن رنگ نہیں۔ جس میں رحم ہے لیکن جھکاؤ نہیں جو آشکار ہے لیکن عریاں نہیں، جو وقت میں نمایاں ہے لیکن وقت میں قید نہیں۔ جو دور بھی ہے اور نزدیک بھی جس میں جمال بھی ہے نیکی بھی اور علم بھی۔

(ب) یہ دنیا ایک مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے۔ جس میں معنی بھی ہیں اور نتیجہ بھی،

انسان خدا کا عکس نہیں ہے لیکن انسانی کوششوں کا مقصود یہی ہے کہ وہ اسکا عکس بن جائے، نیز یہ کہ اس دنیا میں انسان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

(ج) چونکہ یہ کارخانہ انسان کے لئے بنایا گیا ہے لہذا اسے اس پر خدا کا دیا ہوا اختیار ہے اسے یہ حق نہیں کہ اسے جس طرح اور جب چاہے استعمال کرے۔

(د) انسانیت ایک کُل ہے اسے جسمانی طور پر خوبصورتی اور طاقت کیطرف بڑھنا چاہیئے۔ اور روحانی طور پر۔ حسن اور علم کی طرف۔

(ہ) زندگی کے تضاد سے انسان کو گھبرانا نہیں چاہیئے! اس میں مکمل آسودگی پیدا کرنا انسانیت کی معراج ہے۔

(و) یہ مکمل آسودگی اس نقطۂ آغاز سے چل کر حاصل ہو سکتی ہے کہ کائنات ایک عقلی بنیاد پر قایم ہے سائنس اور آرٹ کا مقصد محض اسی عقیدے کی تفسیر ہے۔

یہ عطر ہے اس پیغام کا یہ رس ہے اس نغمے کا جسے قدرت نے آدم کے کان میں پھونکا اور آدم کی پیشانی کا یہ نور نوح، موسیٰ اور عیسیٰ کی پیشانیوں میں منتقل ہوتا رہا۔ اس پر تنور کے پانی نے اثر کیا نہ رومیوں کی صلیب نے۔ نہ بابل کی خاک نے نہ مصر کے دربار نے۔ یہ اسی طرح چمکتا رہا یہاں تک کہ جب دنیا مسیح ناصری کو بھول گئی اور اسے صرف رومیوں کی کہانی یاد رہ گئی تو عرب میں یہ نور پھر کوہِ فاران پر چمکا۔ اسلام آخری بار محمدؐ صلعم نے دنیا کو وہی پیغام سنایا جسے انسان ذاتی اغراض میں غرق کر چکا تھا۔ بت سکون کے ساتھ سنتے رہے کاہنوں نے کانوں پر انگلیاں دھر لیں، بت پرست حواس باختہ ہوگئے، امرا نے سیم وزر کی بازی لگا دی عورتیں اپنا ریشمی حسن لات و عزیٰ پر نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ بچوں نے قہقہے لگائے

بڑوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ ابراہیم اپنے مزار کے جھروکے سے یہ منظر دیکھتے رہے اور خدا آسمان سے !

اسلام کا عطر | محمد صلعم یکہ و تنہا تھے۔ ابھی دنیا میں جہاں ایک شخص ان کا ہمنوا نہ تھا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ عرب کے ریگستان میں چشمے اور آبشار ابلنے لگے اور تیئیس[۲۳] سال نہونے پائے تھے کہ دنیا میں ایک عجیب وغریب سوسائٹی اور اس سے زیادہ انوکھی ریاست قائم ہوگئی جس میں خاندان کی اکائی کو برقرار رکھا گیا شخصی آزادی ہر دائرے میں تسلیم کی گئی۔ محدود وراثت کو تسلیم کرلیا گیا۔ ذرائع آمد وخرچ پر بندش لگادی گئی اور سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے انسان کے ماحول اور بیرونی عناصر ہی کو نہیں تبدیل کیا گیا بلکہ انسان کی نفسی اصلاح کچھ اس طرح کی گئی کہ انسان اپنے آپ' اپنی قوتِ ارادی کے ساتھ' جماعت سے آسودگی قائم رکھتے ہوئے منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

اسلام نے انسان کو شکنجے میں نہیں کسا' اس کی خواہشات کو شہید نہیں کیا، ریاست کو افراد پر مسلّط نہیں کیا۔ اُنہیں آزادی دی گئی کہ وہ ایک دائرے میں نہایت آزادی کے ساتھ چل پھر سکیں۔

اقتصادی نظام میں بنیادی چیز ذاتی فائدہ نہیں، ذاتی ضرورت اور سماجی منافع رکھا گیا اور اسی لئے سود حرام قرار دیا گیا مزدوروں کی اُجرت کے متعلق احکام نافذ کئے گئے، بوڑھوں اور کمزور انسانوں کے لئے ریاست نے وظائف کا انتظام کیا، بچوں کی پرورش اور تربیت کے اخراجات ریاست نے اپنے ذمّے لئے تقسیم جائداد کے قانون نے سرمائے کو دور دور تک پھیلا دیا بیت المال قوم کی جائے پناہ بن گیا جہاں

دھوپ اور بارش میں پناہ لی جا سکتی تھی۔ خلیفہ خادم المسلمین تھا جس سے ہر وقت باز پرس کی جا سکتی تھی قانون کی قوت کا یہ عالم تھا کہ مجرم خود اپنے آپ کو عدالت میں پیش کر دیا کرتا تھا اور عدالت عہد جدید کی عدالت کی طرح مہاجن کی دوکان نہ تھی جہاں انصاف سونے کے مہروں سے خریدا جا سکتا ہے۔ وہاں ہر انسان قانون چلاتا تھا، قانون اپنے اوپر چلاتا تھا، اور چلانا جانتا تھا — یہ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، فرد اور سوسائٹی کے تصادم کا یہاں کوئی سوال نہیں اس لئے کہ ہر فرد ایک نظریہ ایک آرزو ایک چشمۂ ہدایت اور صرف ایک نظام عمل رکھتا تھا۔ اور لطف یہ کہ پھر بھی ان کی شخصیتوں میں شکست وریخت نہیں ہوئی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاری کی شخصیتیں کتنی مختلف تھیں اور کتنی متحرک! یہ خوبی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے شخصیتوں کا آزاد و صالح نشوونما ہر نظام زندگی کی معراج ہے۔

جنگ صفین کے بعد | لیکن دنیا کی بدقسمتی کہ انسان کی کم مائگی نے اُسے زیادہ عرصے تک اس حسین مرکز پر نہ ٹھہرنے دیا حضرت آدم جنت کے نور و نغمے سے دور ہو گئے تو کیا، آسمان سے پانی اور پتھروں کی بارش ہوئی تو کیا، زکریا کو گوشت و پوست کی مورتوں نے آرے سے چیر ڈالا تو کیا، فرض کیجئے کہ مسیح ناصری کو صلیب پر آویزاں کر کے سنگ و خشت کی بارش اور نیزۂ و سناں کے نرغے میں خاک کا پیوند کر دیا تو کیا۔ ہم کیوں روئیں؟ .... روئیے اس پر کہ ابوالقاسم کی میراث چھن گئی، روئیے اس پر کہ اسلام کا نخلستان اپنے ہی شعلوں سے راکھ ہو گیا، روئیے اس پر کہ انسان کی آرزو اور تہذیب کا ثمر اولین یتیم کا اشک خونیں بن کر رہ گیا!!

شخصی ریاستوں کا حشر عجم کی تہذیب آئی، تاج وتخت آئے، دربار کی آنکھ مچولیاں آئیں، طاؤس ورباب آئے، طرّہ و دستار آئے۔ جمہوریت کی روح گئی، نقل وانقیاد کا غلبہ ہوا اور وہ شاندار تجربہ جسے محمدؐ کے پاک ہاتھوں نے پہلی مرتبہ سطح زمین پر کیا تھا انسان کے ہاتھوں شہید ہو گیا!!

کہنے کو ہر جگہ اسلام کا پرچم لہرایا، کئی سو برس تک کلمۂ توحید کا ورد اسی آب وتاب سے رہا نماز عصر کی سنتیں نہ گئیں، رمضان کا اعتکاف نہ گیا اوران سب کے باوجود دنیا نے جوع الارض کے تماشے بھی دیکھے مسلمان فوجوں کی غارتگری بھی دیکھی، مینا بازار بھی دیکھے جنسی فتوحات بھی دیکھیں، جاگیرداری کا نظام بھی دیکھا، سب کچھ دیکھا اور بالآخر یہ بھی دیکھا کہ اگر ایک طرف ترک ویانا کے دروازے تک پہنچے تو دوسری طرف بنی فاطمہ نے دم توڑا۔ ہندوستان کا چراغ گل ہوا تو مصر خود پکے پھل کی طرح انگلستان کی گود میں جا پڑا۔ اس صدمے سے جانبر نہ ہوئے تھے کہ جنگِ بلقان چھڑی جس نے ترکی کو یورپی اقوام کے سامنے عریاں لا کھڑا کیا، ابھی تازہ وارد سپاہی دو کہانیاں بھی نہ سنا چکا تھا کہ جنگِ عظیم نے مغرب کے افق سے دھوئیں اڑائے اور دیکھتے دیکھتے خلافت عثمانی کی نعش نذرِ آتش کر دی گئی۔

تاہم البتہ ایک بات یاد رہے کہ اسلام ہمیشہ زندہ طاقت رہا ہے اوران چند سو سال میں اسلام نے جتنی نیک شخصیتیں پیدا کیں دنیا کا کوئی نظام نہ کرسکا! انفرادی زندگی میں پاکیزگی خوش خلقی اور ایثار کو آمیز کر دیا۔ اگر ہم اب سے دو سو سال پہلے کے مسلمان گھرانوں میں تاریخ کی بیساکھیاں لگا کر جا سکیں تو ہمیں ان پر رشک بھی آئیگا اور حیرت بھی ہوگی۔

سب سے عجیب بات یہ کہ شخصی ریاستوں نے مسلمانوں کو بالکل ہلا دیا لیکن انہیں پھر بھی زندگی اور رَس باقی رہا جس کا مظاہر شخصیتوں اور اداروں میں مسلسل و مستقل ہوتا رہا۔ رومی اور سہروردی کو چھوڑیئے ابھی ماضی قریب ہی میں مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کا ایک نورانی حلقہ نظر آتا ہے۔ شمالی ہند میں مجدد الف ثانی نے توحید کا سبق دیا۔ نجد میں عبدالوہاب نے پھر سے حدی خوانی کی، مصر میں ابن تیمیہ نے سنت کی طرف بلایا اور مسلمانوں کا شانہ ہلا ہلا کر جگایا، افغانستان میں جمال الدین اٹھے جنہوں نے مسلمانوں میں اجتماعی شعور پیدا کیا، شمالی افریقہ میں سنوسی نے مسلمانوں میں مذہبیت بیدار کرنے کی کوشش کی، ہندوستان میں سرسید نے مشرقی اور مغربی تہذیب کو ایک سنگم پر لا کھڑا کیا، شبلی نے مسلمانوں میں جان پیدا کرنے کے لئے تاریخ کو دہرایا اور شخصیتوں کی مصوری کی، اور ان سب سے قطع نظر —— خالص عملی تحریکات کی داستان یہ ہے کہ جوں ہی مسلمانوں پر دوسروں کا تسلط ہوا مسلمان بیتاب ہو گئے۔ ہندوستان میں ٹیپو اور سید احمد شہید نے علم بغاوت بلند کیا، مصر میں عربی پاشا نے روحِ جہاد پھونکی قاف میں شامل نے روسیوں کے خلاف سر اٹھایا الجیریا میں عبدالقادر نے مسلمانوں کو حرکت دی سوڈان میں مہدی نے فتح و کامرانی کے ڈنکے بجائے۔ طرابلس میں عبدالکریم مجاہد ریف نے طوقِ غلامی توڑنے کی سعی کی سرحد کے غیور بار بار اٹھے، سماترا میں آچیوں نے زنگ آلودہ تلواریں میاں سے نکالیں، ہندوستان میں تحریکِ خلافت نے بچے بچے کے دل میں آزادی کے شعلے بھڑکا دیئے موپلوں نے جدوجہد کی اور سب سے آخر میں مصطفیٰ کمال نے ترکی کے مرد بیمار کو اپنی مسیحا نفسی سے دولِ یورپ کے دوش

بردوش لا کھڑا کیا۔

نظری اور عملی پہلوؤں سے علمی کوششوں کی طرف آیئے تو جامعۂ ازہر کو دیکھئے۔ دنیا کی یہ سب سے بڑی اور سب سے پرانی جامعہ مفتی محمد عبدہٗ اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے نئے قالب میں ڈھالی گئی، ایران و ترکی میں علوم جدیدہ کے لئے یونیورسٹیاں کھولی گئیں، ہندوستان میں مدرستہ العلوم (علی گڑھ) قائم کیا گیا جو دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کے پہلو بہ پہلو نظری اختلاف کے باعث دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی علامہ شبلی نے ان دونوں کے بہترین عناصر کو لے کر ندوۃ العلوم کی تاسیس کی۔ جامعہ ملیہ کا تجربہ اپنی جگہ انوکھا خوبصورت اور مخلصانہ ہے۔ ان تمام اداروں کے نام میں نے صرف اس لئے گنائے کہ یہ محض دولت کی بازیگری نہیں بلکہ ان کی تہ میں زبردست نظریئے کارفرما ہیں۔ ایک معنی میں یہ خوش قسمتی ہے کہ ان سب کی بنیاد سچے اختلاف پر ہے۔ جس قوم میں سنجیدہ مسائل کو سوچنے اور ان میں اختلاف رائے کی ہمت ہو وہ قوم کبھی مردہ نہیں ہوسکتی یہ ادارے مسلمان قوم کی بہترین ذہانت کا اور ایک نقطۂ نظر سے اسلام کی زندگی کا ثبوت ہیں۔ عربی فارسی اور بالخصوص اردو نے جس قدر ترقی کی وہ اس بات پر دال ہے کہ مسلمانوں میں ابلتی ہوئی زندگی موجود ہے اور کیا ہماری زندگی کا یہ کم ثبوت ہے کہ اقبال نے مسلمانوں میں جنم لیا سچ تو یہ ہے کہ اقبال ہمارے سیکڑوں سال کے گناہوں کی تلافی ہیں۔

اصل کی طرف اقبال نے مسلمانوں کے زندہ کرنے میں بڑا حصہ لیا انہوں نے بتایا کہ ہماری بقا اور دنیا کی نجات اسلام میں ہے۔ ہماری تحریکات کا دائرہ اب وسیع ہوتا جا رہا ہے اُن میں آفاقیت آرہی ہے اور وقتی جوش کے بجائے ان میں وہ

قوت اور خاموشی پیدا ہو رہی ہے جو سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہے اس قسم کی ایک تحریک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک ہے۔

اسلامی ریاست اور اسلامی سماج | یہ تحریک مسلمانوں کے سامنے فوری مقصد نہیں رکھتی جو چند سال کی کوششوں میں ختم ہو جائے اور سطح پر چند بلبلے آکر ٹوٹ جائیں اس کا نصب العین وہ انسانی اور بلند نصب العین ہے جو محمد صلعم کی بہترین میراث ہے ایک سوسائٹی جس میں نظم ہو جس میں انقلاب کا مادّہ ہو، جو یقین پر تعمیر ہو جو نیابت الٰہی کا بار اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکے جس کا تعلیمی نظام ایک خاص اخلاقی اور جمالی نظریئے کے مطابق شخصیتوں کی نشو و نما کرے اور بالآخر یہ سوسائٹی اپنی روحانی اور مادّی قوتوں کو اپنی ریاست میں منعکس کرے۔ وہ ریاست اخلاقی، قانونی اور سائنٹفک قوت ہو جو اکثریت کے دوش کا جنازہ ہو نہ فرد واحد کی غلامی، جو نہ ازمنۂ وسطیٰ کی طرح خانقاہوں کی بساط بنکر رہے نہ عہد جدید کی طرح جماعتوں کا آلۂ کار ہو، جو نہ پرو مَاری آمریت ہو، نہ بیکونن کی انارکی۔ بلکہ ایک مرکزی مجلس ہو جس کا کام (الف) کی حدود میں الٰہی قوانین کو قوت کے ساتھ چلانا اور (ب) دنیا میں اُسکی تبلیغ کرنا ہو اس تحریک کا طریقۂ تنظیم و تبلیغ وہی ہے۔ جو اصحاب صفہ نے محمد صلعم کی رہنمائی اور اسلام کی روشنی میں پیش کیا تھا۔

یہ تحریک نہ والیانِ ریاست کو بھائے گی نہ خانقاہ کے پجاریوں کو، نہ انسان سے متنفر دل اسے پسند کریں گے نہ اغراض سے محبت کرنے والے دماغ۔ ذمہ داری سے گریز کرنے والے اِسے خوش آمدید کہہ سکیں گے نہ علم سے عاری راہ نما، شخصیت پرست اسے لبیک کہہ سکیں گے نہ قدامت پسند۔ اسے صرف

وہ دل قبول کریں گے جنہیں گنبدِ خضرا سے محبت ہے جن کے لئے خلافتِ راشدہ ایک حقیقی رومان ہے، جو سیاسی زندگی کو میکاوُلی کے ہاتھوں سے نکالکر صدیق کے قدموں میں اور بسمارک سے تلوار چھین کر خالد کے ہاتھوں میں دے دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا مقصد | مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب حضرت مودودی کے پاکیزہ مضمون سے شروع ہو رہی ہے یہ کتاب کیا ہے؟ — مسلمانوں کے جگانے کی ایک کوشش۔ انکے ضمیر سے پردے اٹھانے کی ایک حقیر سی سعی، اس بڑے سمندر میں نیاز کا ایک قطرہ جسے لحیاءِ اسلام سے تعبیر کرتے ہیں، اس کتاب کے مضامین ایک آئینہ بھی ہیں جس میں ہم اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں اور بانگِ عمل بھی، جس پر ہمیں لبیک کہنا چاہیئے۔ کسقدر شکریہ ادا کیا جائے ان بزرگوں کا جنہوں نے اپنے مہربان ہاتھوں سے ہماری آرزو کو جامۂ عمل پہنایا جنہوں نے نیم شب چراغ کا تیل جلا کر صفحۂ قرطاس پر دل ودماغ کا عکس اتارا اور ہمیں بارِ احسان اٹھانے کا موقع دیا ہمیں مسرت ہے کہ ہم سب ایک مخلصانہ کام میں شریک ہیں۔ میں حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، استاذی ضیاء احمد صاحب بدایونی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، اسلوب احمد صاحب انصاری، جناب لطیف صاحب اعظمی، نیز حضرت مولینا سید سلیمان صاحب ندوی کا (جنہوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی فرمائی) تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ ناانصافی ہو گی اگر میں آفتاب ہال کے پرووسٹ جناب غلام سرور صاحب ایم، اے لیڈس کا پوری سچائی کے ساتھ شکریہ ادا نہ کروں جو لائق وفاضل استاد ہونے کے علاوہ طلباء کے ساتھ بے حد انوس اور ان کی ہر ترقی پسند کوشش میں شریک رہتے ہیں اور اس شرکت میں دلی

مسرت محسوس کرتے ہیں جناب سرور صاحب طلبار کے معاملے میں بے حد مخلص ہیں اس لئے مجھے ان کا شکریہ ادا کرنے میں خوشی ہوتی ہے مجھے جناب ملک حامد حسن صاحب کی خدمات کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے جن کی محنت اور انتہائی اخلاص کا میں دل سے قائل ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا جن کا دل و دماغ بہ حیثیت ناظم مجلس میری ہر تجویز کے ساتھ رہا ہے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے عزیز دوستوں کا بھی تذکرہ کروں جو آفتاب مجلس کے تمام کاموں اور اس سلسلے میں میری قوت کا باعث رہے، میرے شکریئے کے مستحق -

جناب سعید احمد صاحب صدیقی و جناب محب اللہ صاحب لاری، وجناب اشفاق احمد صاحب نقوی وجناب سید حبیب صاحب، جناب محمد انور صاحب فرنگی محلی، وجناب چودہری قمر الحسن صاحب وجناب سعید احمد صاحب عمروی، وجناب شجاع احمد خاں صاحب وجناب اسرار اللہ صاحب صدیقی اور جناب وہاج الدین احمد صاحب کرمانی -

والسلام

وما علینا الا البلاغ

خورشید الاسلام عمروی

اراکین کابینہ انقلاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سنہ ۳۱—۱۹۳۰ ع



بائیں سے دائیں کو کھڑے ہوئے اصحاب:—(۱) سید اشفاق احمد نقوی (۲) مرزا شاہد علی بیگ (۳) سید محمد حبیب (۴) چودھری قمرالحسن

بائیں سے دائیں کو بیٹھے ہوئے اصحاب:—(۱) محمد انور انصاری (۲) ملک حامد حسین (۳) جناب غلام سرور صاحب (۴) خورشیدالاسلام

صدر — صدر اعلیٰ — معتمد اعزازی — (۵) سید قدرت اللہ

تجدید واحیاء دین

مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر

حضرت مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

(یہ مقالہ جریدہ "الفرقان" بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے لکھا گیا
تھا اور جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اجازت سے نقل کیا جاتا ہے)

اسلام کی اصطلاحی زبان کے جو الفاظ کثرت سے زبانوں پر آتے ہیں اُن میں سے ایک لفظ "مجدّد" بھی ہے۔ اس لفظ کا ایک مجمل مفہوم تو قریب قریب ہر شخص سمجھتا ہے، یعنی یہ کہ جو شخص دین کو از سر نو زندہ اور تازہ کرے وہ مجدّد ہے، لیکن اس کے تفصیلی مفہوم کی طرف بہت کم ذہن منتقل ہوتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ تجدید (Revival) کی حقیقت کیا ہے، کس نوعیت کے کام کو "تجدید" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کام کے کتنے شعبے ہیں، مکمل تجدید کا اطلاق کس کارنامے پر ہو سکتا ہے اور جزوی تجدید کیا ہوتی ہے۔ اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ لوگ اُن مختلف بزرگوں کے کارناموں کی بھی پوری طرح تشخیص نہیں کر سکتے جن کو تاریخ اسلام میں مجدّد قرار دیا گیا ہے۔ وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ عمر ابنِ عبدالعزیز بھی مجدّد، امام غزالی بھی مجدّد، ابن تیمیہ بھی مجدّد، شیخ احمد سرہندی بھی مجدّد اور شاہ ولی اللہ بھی مجدّد۔ مگر ان

کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس حیثیت سے مجدّد ہے اور اس کا تجدیدی کارنامہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہے۔ اس ذہول و غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جن ناموں کے ساتھ "حضرت"، "امام"، "حجۃ الاسلام" "قطب العارفین"، "زبدۃ السالکین"، اور اسی قسم کے الفاظ لگ جاتے ہیں ان کی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کاموں کا جائزہ لیکر ٹھیک ٹھیک مشخص کر سکے کہ کس نے اِس تحریک کے لئے کتنا اور کیسا کام کیا ہے۔ اور اس خدمت میں اُس کا حصہ کس قدر ہے۔ عموماً تحقیق کی بنی تلی زبان کے بجائے اِن بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیئے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر یہ اثر پڑتا ہے، اور شائد لکھنے والے کے ذھن میں بھی یہی ہوتا ہے، کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مرد کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری درجہ پر پہنچا ہوا تھا، حالانکہ اگر اب ہم کو تحریک اسلامی کی تجدید و احیاء کے لئے کوشش کرنی ہے تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑے گا اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ اِن بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کتنا کام کس کس طرح کیا ہے، اُن کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ان سے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے۔

یہ مضمون ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ مگر کتاب لکھنے کی فرصت کہاں۔ یہی غنیمت ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکر خیر چھڑ گیا جس کی وجہ سے اس مضمون کی طرف چند اشارے کرنے کا موقع نکل آیا۔ شائد کہ انہی اشاروں سے کسی اللہ کے بندے کو تاریخ تجدید و احیاء دین کی تدوین کا راستہ مل جائے۔

اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش

تجدید کی حقیقت و نوعیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسلام اور جاہلیت کی اصولی اور تاریخی کشمکش کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، کیونکہ تجدید دراصل نام ہے جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکال کر از سر نو چمکا دینے کا۔ پس آدمی نہ تو تجدید کو جان سکتا ہے نہ کسی مجدد کے کام کو پرکھ سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں متصادم قوتوں کو اور ان کی کشمکش کو واضح طور پر نہ سمجھ لے۔

دنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام نامہ بھی بنایا جائیگا۔ اسکی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الٰہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق، جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیئے اور کس طرح اُسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیئے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جو حل بھی

تجویز کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا۔ پھر اُسی نظریۂ اخلاقی کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت وکردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاقی مرتب کرنا پڑا ہے۔ اور اصول سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے، کیونکہ ہر دستورِ زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے، اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں، اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے:۔

جاہلیت خالصہ | ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت، اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونیکا

انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہوگیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا اور کس لئے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور اپنے گرد و پیش زمین کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے۔ جن پر وہ اپنے ان قوٰی اور آلات کو استعمال کرکے اپنی خواہشوں کی تکمیل کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے، اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو، لہٰذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیئے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جواب دہ ہو، اس لئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جواب دہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے۔ یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہوکر افراد پر مستولی ہوجائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل

اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ صرف انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیت محضہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت تک وہ نہیں پہنچتا یا بندگی نفس کی وجہ سے نہیں پہنچنا چاہتا، تو اس کے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور ارباب حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے؛ اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں، بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے۔ اگرچہ اہل مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو روح ان کے پورے نظام تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے، اور وہ کچھ اس طرح ان کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دہریہ اور مادہ پرست ہی ہیں، کیونکہ اُن کے علمی نظریہ کا اُن کی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے

خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر ان کی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بنتا تھا کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت ہے، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل میں ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے کے لئے ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اس کا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ:-

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اوپر میں نے اشارہ کیا، اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اسکی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے، خواہ وہ کتابوں میں مدوّن ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں الحاد و مادّیت کی روح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں، انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں، اور قوانین کا نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ ابھر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بد دیانت، جھوٹے، دغا باز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پروا ہو کر خلق خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میکیاویلی (Machiavelli) کے اصول سیاست پر ان کی ساری حکمت عملی بنی ہوتی ہے۔ ان کی کتاب آئین میں زور کا نام حق اور

بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادّی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

جاہلیت مشرکانہ | دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے۔ اور نہ بے خداوند ہے۔ مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت (Scientific proot) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے، اس لئے موہوم محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، سیّارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، اور معانی مجردہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوت تخلیق، بیماری، جنگ، بھلی، شکتی وغیرہ، اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر اس دیومالا کے گرد اوہام وخرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوش ربا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی

شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیئے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور نمایاں پایا گیا ہے۔ وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اس کے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں، مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا اس لئے اس کے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلا یا تقریباً مفقود ہے، وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیت خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے، وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے، اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک

نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی ثبوتِ علمی کے ان بزرگوں کی ولادت ووفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے تیسری طرف توسّل اور استمداد روحانی اور اکتسابِ فیض وغیرہ ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں، ان بزرگوں سے متعلق ہو گئے اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کو ماننے والے اُن مشرکین کے ہاں ہے جن کے نزدیک بادشاہِ عالم انسان کی رسائی سے بہت دور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور نیچے کے اہلِ کاروں ہی سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن کے ہاں یہ اہلکار علانیہ الٰہ، دیوتا، اوتار یا ابن اللہ کہلاتے ہیں، اور یہ انہیں غوث، قطب، اولیاء اور اہل اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

یہ دوسری قسم کی جاہلیت تاریخ کے دوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیت، یعنی جاہلیت خالصہ کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدن کا بھی یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف میں اشارہ کروں گا۔

اولاً مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ

اس کے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں اُن کو صاحب اختیار اور نافع و ضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسم عبودیت کے ذریعہ سے اپنے دنیوی مقاصد میں اُن کی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہاں اسکو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون وضابطہ ملے، تو اسکا کوئی امکان ہی نہیں، کیونکہ وہاں کوئی واقع میں خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیت محضہ برسرکار آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے، اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں، ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونان قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے، اس کا یہی سبب ہے۔ اس نظرئے کی روشنی میں موجودہ زمانے کے مسلمان آپکو کیسے دکھائی دیتے ہیں؟۔

ثانیاً علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لئے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیت محضہ ہی کا رخ اختیار کرتا ہے! ور مشرک سوسائٹی کا سارا دماغی نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا

کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوت واہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لئے ان کے افکار میں خیال آرائی Speculation کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے نرے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی استدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی میتھالوجی۔ بہرحال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیت خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً مشرک سوسائٹی اُن تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوتی ہے جن کو خالص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیت خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے۔ روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹرشپ، سرمایہ داری

اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے، اور انسانیت کو تقسیم کرکے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لئے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

جاہلیت راہبانہ | تیسرا ما بعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح اس قفس عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق رکھیگا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اُسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائیگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، اُن تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیا اور گوشت و خون کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں، دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن، یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اسکا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہوجائیگی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti-Social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر

یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، اشراقیت (Noe-Platonism)، یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت، اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر لٹریچر، عقائد، اخلاقیات اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متوّلی بنکر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں، اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کئے چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں وہ انکے اندر غلط قسم کا صبر و تحمل، اور مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لئے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امراء، اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں، اور یہ خوب آرام سے ان کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی

مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور روحانی ریاست سے اس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

(۳) جب یہ رہبانی فلسفہ واخلاق، انسانی فطرت سے شکست کھاتا ہے تو کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لئے عشقِ مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھا بھی لی جائے اور تقدس بھی جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں ترک دنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے، جس کی بدترین مثالیں روم کے پاپاؤں، اور مشرقی دنیا کے گدی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں جب یہ گھس آتی ہے، تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بھاگنا چاہیئے۔ میرے لئے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کوآپریٹر کی طرح رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے

بجائے اُن سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے! اور بار خلافت سنبھالنا تو درکنار، بارِ تمدن کو بھی اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لئے پورا نظام شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکلیہ ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول سے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیئے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت نے انبیاء کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلہ کشی و ریاضت، اوراد و وظائف، احزاب و اعمال، سیر مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکر میں ڈال کر مستحبات و نوافل کے التزام میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے، خلافت الٰہیہ کے اُس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے تھے! اور دوسرے گروہ میں تقشف، التعمق فی الدین، غلو، موشگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے لئے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ بن گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے۔ کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے،

کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہِ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے لئے مستعد ہوں۔

اسلام چوتھا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گردو پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزء ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اس کو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سب کے سب تابع امر ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے، یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ اس نظامِ حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری وغیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جزءِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لئے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اسکا حاکم نظر آتا ہے نہ کارپرداز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہر حواس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے حساب دنیا ہے۔ اعیان وشہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اترتی دکھائی دے یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر ان کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دیدی جاتی ہے، ذرائع بہم پہنچا دئیے جاتے ہیں، اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے، حتیٰ کہ شرارت وعصیان کی آخری حدود کو پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا، پوری آزادی دیجاتی ہے کہ جس جس کی بندگی، عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں (یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں) میں رزق برابر ملتا ہے، سامانِ زندگی وسائلِ کار، اسبابِ عیش حسبِ حیثیت خوب دئیے جاتے ہیں۔ اور مرتے دم تک

دئے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسباب دنیا روک لئے جائیں۔ یہ سارا طرزِ کارروائی صرف اس لئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے! اسی آزمائش کی تکمیل کیلئے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہو تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کرکے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسباب زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دئے گئے ہیں، اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک کسی کارکن کو سرمایہ، وسائل، اور کام کا موقع نہ دیا جائے اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لئے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے۔ اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانونِ طبعی کے تحت، جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، اور قابلِ اخذ یا قابلِ ترک ہونیکا

معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ (آزادیِ انتخاب رکھنے کے باوجود) اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمل توجیہ (Explanation) ہوتی ہے۔ کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پوری تعبیر ملتی ہے اور کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے۔ کائنات اور خود وجودِ انسانی کے متعلق معلومات کے پورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جو جاہلی علوم کی ترتیب سے سراسر متبائن ہے۔ ادب اور ہنر (Art and Literature) کی نشو و نما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغائر ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہائے نظر سے اپنی

روح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میں نہیں کھاتا۔ اخلاق کا ایک علیحدہ نظام بناتا ہے جس کو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اس کی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور اُس کو سنبھالنے کے لئے ایک اور ہی طرز کے نظام تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اصول جاہلیت کے ہر نظام تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے، بخلاف اس کے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خودمختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی لئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ و روغن جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر بنتی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، لباس، خورا، طرز زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسب معاش، صرف دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، سول سروس کی

تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگزاری، فینانس، امور نافعہ (Public Work) صنعت و تجارت خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی تربیت و تنظیم جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جزء میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد اور ایک خاص اخلاقی رویہ کارفرما ہوتا ہے جس کا براہِ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیتِ مطلقہ اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے بڑا ہوا ہے۔

نبی کے کام کی نوعیت

اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام پے درپے بھیجے گئے تھے۔

رہبانی تہذیب کو مستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دنیا کو چلانے کے لئے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا

نقشہ اپنے طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی نظریہ وضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات کو چلانا ہی نہیں چاہتا بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اس لئے نہ اس کو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لے کر اٹھے اور اسی ڈھنگ میں انسان کی فلاح و سعادت کا معتقد ہو، اس کے لئے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اپنے نقشہ پر عملدرآمد کرنے کی طاقت جب تک وہ حاصل نہ کرے اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کاغذ پر اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے، وہی علوم و افکار اور فنون و آداب کی رہنمائی کرتی ہے، وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے، وہی تعلیم و تربیت عامہ کا انتظام کرتی ہے، اسی کے قوانین پر سارا نظام تمدن مبنی ہوتا ہے، اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اُس تہذیب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمراں تہذیب کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمراں تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہوتی ہے۔ اسکی طرف ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اسکے نام نہاد علم بردار اور اس کی لیڈر شپ کے بزعم خود وارثین تک تہذیب مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اتر آتے ہیں،

حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مقاسمت و مصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے اور انسانی تمدن اس غرک کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بٹائی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے اور اسکے لئے راضی ہونا ایمان اور ہمت کی کمی پر۔

پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کرکے اُس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اُس میں اپنے جاہلی طریقوں پر بھی چلتے رہیں۔ مگر وہ اُنہیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھے اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراھیمؑ۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی اُن کا کام ختم ہوگیا، جیسے حضرت مسیحؑ۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین فی الجملہ تمام انبیاء کے کام پر مجموعی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کام کی نوعیت یہ پائی جاتی ہے:۔

(۱) عام انسانوں کے اندر فکری و ذہنی انقلاب برپا کرنا۔ خالص اسلامی

نقطۂ نظر وطرزِ فکر اور رویّہ اخلاقی کو ان کے اندر اس حد تک پیوست کر دینا کہ ان کے سوچنے کا طریقہ، زندگی کا مقصد، قدر وقیمت کا معیار اور عمل کا ڈھنگ بالکل اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔

(۲) جو لوگ اس تعلیم وتربیت کا اثر قبول کرلیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنا کر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کی جدوجہد کرنا اور اس جدوجہد میں تمام ان اسباب سے کام لینا جو وقت کے تمدن میں موجود ہوں۔

(۳) اسلامی نظامِ حکومت قائم کرکے تمدن کے تمام شعبوں کو خالص اسلام کی اساس پر مرتب کر دینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ ایک طرف اسلامی انقلاب کا دائرہ روئے زمین پر وسیع ہوتا جائے اور دوسری طرف تبلیغ اور تناسل کے ذریعہ سے جماعت اسلامی میں جتنی نئی بھرتی ہو اس کی ذہنی واخلاقی تربیت پورے اسلامی طرز پر ہوتی رہے۔

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچا دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل لیڈر اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمامِ قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

جاہلیت کا حملہ | مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ، جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، اُن تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر

پیش رووں کو عطا ہوئی تھیں، اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر اُن کی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس (Counter Revolution) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا ملکِ عضوض (Tyrant Kingdom) نے اس کی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اُس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا، سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہرئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر رہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پہ عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اُس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے، عریاں جاہلیت سے لڑئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر

لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اُس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اِس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اُس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالینگے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا۔ جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلّم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے:۔

جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا، اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اس لئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانے سے وہی مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا اور علوم و فنون بھی اُسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور

حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں، اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں اِن پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اُس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کیطرف منسوب تھی، اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پُرزے نکالنے لگا اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ رقص، موسیقی اور تصویرکشی جیسے خالص جاہلی آرٹ بھی از سرِنو اُن قوموں میں بار پانے لگے جن کو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا۔ؔ

جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں، اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات اُن کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر

ؔ۔ مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی جیسے لوگوں نے اِن بادشاہوں کے اِن کارناموں کو اسلامی تہذیب و تمدن کی خدمات میں شمار کیا ہے!

نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی، مشرکانہ اعمال کے لئے اسلام کی اصطلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کے لئے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرکِ جلی کی تعریف میں نہ آسکیں۔ اس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بے چارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہّاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔

انہی تینوں قسم کی جاہلیتوں کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا جس کے لئے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی۔ اگرچہ یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس طغیانِ جاہلیت میں اسلام بالکل ختم ہو گیا تھا اور جاہلیت کلیتہً غالب آگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں اسلام سے متاثر ہو چکی تھیں یا بعد میں متاثر ہوئیں۔ ان کی زندگیوں میں اسلام کا اصلاحی اثر تھوڑا یا بہت ضرور موجود رہا۔ جبار اور غیر ذمہ دار بادشاہوں تک میں اسلام کے اثر سے کہیں نہ کہیں خوفِ خدا

کی جھلک نظر آہی جاتی تھی۔ جن شاہی خاندانوں میں خدائی کا زنگ جما ہوا تھا اُن کی آغوش میں دیندار، عادل اور متقی انسان بھی پیدا ہو جاتے تھے اور وہ شاہی اختیارات رکھنے کے باوجود حتی الامکان ذمہ دارانہ حکومت کرتے تھے، اسی طرح امارت و ریاست کے ایوانوں میں، فلسفہ و حکمت کے مدرسوں میں، تجارت و صنعت کی کارگاہوں میں ترک و تجرید کی خانقاہوں میں، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اپنے بالواسطہ اثرات کم و بیش برابر پہنچاتا رہا، اور عوام کے اندر بھی مشرکانہ جاہلیت کی دراندازی کے باوجود اس نے اعتقاد، اخلاق اور معاشرت میں اصلاحی اور سندی دونوں حیثیتوں سے اپنا نفوذ جاری رکھا جس کی وجہ سے مسلمان قوموں کا میّار اخلاقی بہرحال غیر مسلم قوموں سے ہمیشہ بلند تر رہا۔ علاوہ بریں ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی برابر موجود رہے جو اسلام کی پیروی پر ثابت قدم تھے اور اسلامی علم و عمل کو اپنی زندگی میں اور اپنے محدود حلقۂ اثر میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو مقصد اصلی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اس کے لئے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہ بات کافی تھیں کہ چند افراد یہاں اور چند وہاں محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام و جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہٰذا دین کو ہر دور میں ایسی طاقتور شخصیتوں کی ضرورت تھی اور رہے جو زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدلکر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں۔ خواہ کلاً یا جزوً۔ انہی شخصیتوں کا نام مجدد ہے۔

کارِ تجدید کی نوعیت

اب قبل اس کے کہ ہم مجدّدینِ امت کے کارناموں کا جائزہ لیں ہمیں خود اس کارِ تجدید کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

عموماً لوگ تجدّد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدّد کو مجدّد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیا طریقہ نکالے اور اس کو ذرا زور سے چلا دے وہ مجدّد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو برسرِ انحطاط دیکھ کر اس کو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی برسرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام و جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کر اُس قوم کو پورے جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، اُن کو مجدّد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ مجدّد نہیں متجدّد ہوتے ہیں، اور اُن کا کام تجدید نہیں تجدّد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں ہے، اور نہ اسلام و جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزا سے چھانٹ کر الگ کیا جائے، اور کسی نہ کسی حد تک اس کو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدّد، جاہلیت کے مقابلہ میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے، اور کسی خفیف سے خفیف جز، میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔

مجدد نبی نہیں ہوتا مگر اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت، اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان تمیز کرنا، اور مدتہائے دراز کی الجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا، یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص مجدد نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔

لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ تشریعی سے مامور ہوتا ہے، اس کو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے، اس کے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے، اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے، اور اس کے دعوے ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مجدد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اگر مامور بھی ہوتا ہے تو امرِ تکوینی سے نہ کہ امرِ تشریعی سے۔ بسا اوقات اس کو خود اپنے مجدد ہونے کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اسکے

مرنے کے بعد اس کی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اس کے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اُس پر الہام ہونا ضروری نہیں اور اگر ہوتا ہو تو لازم نہیں کہ اسے الہام کا شعور ہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کے زمانہ کے تمام اہلِ خیر و صلاح رفتہ رفتہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جن کی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوتی ہے مگر بہرحال اس کو ماننا مسلمان ہونے کے لئے شرط نہیں ہوتا۔ ان تمام فروق کے ساتھ مجدد کو فی الجملہ اُسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے۔

اس کارِ تجدید کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لیکر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے، کن کن راستوں سے آئی ہے، اسکی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں، اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یعنی یہ تعین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستہ سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد

افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا۔ نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیار کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذھنیت کو از سرِ نو تازہ کر دینا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباعِ شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا، اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح رد و بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں، اور تمدن کے صحیح ارتقار میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جد و جہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لئے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) احیارِ نظامِ اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سرِ نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش، یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا، بلکہ ایک ایسی طاقتور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام

انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظام تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو، اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت وریاست اسلام کے ہاتھ میں آئے۔

ان شعبوں پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لئے ناگزیر ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی ۶ مدیں ایسی ہیں جن کا جامع ہونا مجدد ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، بلکہ جس نے ایک، دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد، جزوی مجدد ہوگا، کامل مجدد نہ ہوگا کامل مجدد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثت نبوت کا حق ادا کرے۔

مجدد کامل کا مقام تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہوجاتے مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی لیڈر کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشگوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں [1]

---

[1] اگرچہ یہ پیشگوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کیساتھ

موجود ہیں، اگر یہاں اُس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسماعیل شہید نے منصبِ امامت میں نقل کی ہے:۔

ان اول دينكم نبوة ورحمة	تمہارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہوا اور
وتكون فيكم ما شاء الله ان تكون ثم	وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔
يرفعها الله جل جلاله	پھر اللہ جل جلالہٗ اس کو اٹھا لیگا۔
ثم تكون خلافة على منهاج النبوة	پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ
ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله جل جلاله	چاہے گا، پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تكون ملكا عاضا فيكون ما شاء الله	پھر بدا طوار بادشاہی ہوگی اور جو کچھ اللہ چاہیگا
ان يكون ثم يرفعه الله جل جلاله	وہ ہوگا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تكون ملكا جبرية فتكون	پھر جبر کی فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ
ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله جل جلاله	چاہیگا رہیگی پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تكون خلافة على منهاج النبوة	پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے
تعمل في الناس بسنة النبي ويلقي	درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کریگی اور اسلام
الاسلام بجرانه في الارض يرضى عنها	زمین میں پاؤں جما لیگا۔
ساكن السماء وساكن الارض لا تدع	اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے
السماء من قطر الا صبته مدرارا	اور زمین والے بھی! آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں
ولا تدع الارض من نباتها وبركاتها	کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے
شيئا الا اخرجته	خزانے اگل دے گی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنیً یہاں تمام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷ پر)

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں! انکو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مرد کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اس لئے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لیکر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہئے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مرد ے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے، لہذا یہ محض ایک وہم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پچھلے انبیا ر نے بھی اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوع انسان کی دنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے: ایک دفعہ اسلام ساری دنیا کا دین بنے گا، اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اُس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہوگی جو انبیار کے طریقہ پر کام کرکے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دیگا۔

روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اسی معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف صاف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گذر چکے ہیں اور چوتھا اب گذر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشینگوئی کی گئی ہے، تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے "ازم" آزمائے جا چکے ہیں اور بری طرح ناکام ہوئے ہیں! آدمی کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

توآخراس میں وہم کی کونسی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اس کی روح نکال کر اوہام کے لبادے اس کے گرد لپیٹ دئے ہوں۔

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ وصوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہونگے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے، علماء اور مشائخ کتابیں لئے ہوئے پہنچ جائنگے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کرکے انہیں شناخت کریں گے، پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائیگا، چلّے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے چلیگا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائینگے جس کافر پر نظر مار دینگے تڑپ کر بے ہوش ہو جائیگا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے، عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقلی وذہنی ریاست، سیاسی

تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکّہ جما دے گا، اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی "جدتوں" کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کرینگے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائیگا۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کریگا۔ بلکہ شائد اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سُنایا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعوےٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اُس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف والہامات، اور چلّوں اور "مجاہدوں" کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید جد و جہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گذرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر School of Thought پیدا کریگا، ذہنیتوں کو بدلے گا۔

ایک زبردست تحریک اٹھائیگا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کریگی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائیگی، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دیگی"۔

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر و پرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سُن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو؟

جزوی مجدّدین اور ان کا کام | تاریخی ترتیب کو چھوڑ کر مستقبل کے مجدّدِ اعظم کا ذکر میں نے پہلے اس لئے کر دیا کہ لوگ پہلے مجدّدِ کامل کے مرتبہ و مقام سے واقف ہو جائیں تاکہ کمالِ مطلوب کے مقابلہ میں ان کے لئے جزوی تجدیدوں کے مرتبہ و مقام کا اندازہ کرنا آسان ہو جائے۔ اب میں ایک مختصر نقشہ اس تجدیدی کام کا پیش کرونگا جو اب تک انجام پا چکا ہے۔

عمر ابنِ عبد العزیز

اسلام کے سب سے پہلے مجدّد عمر ابنِ عبد العزیزؒ[۱] ہیں۔ شاہی خاندان میں آنکھ کھولی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے باپ کو مصر جیسے عظیم الشان صوبہ کا گورنر پایا۔ بڑے ہوئے تو خود اموی سلطنت کے ماتحت گورنری پر مامور ہوئے۔ شاہان بنی امیہ نے جن جاگیروں سے اپنے خاندان کو مالا مال کیا تھا اُن میں اِن کا اور ان کے گھرانے کا بھی بہت بڑا حصّہ تھا حتیٰ کہ خاص ان کی ذاتی جائداد کی آمدنی پچاس ہزار اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ رئیسوں کی طرح پوری شان سے رہتے تھے۔ لباس، خوراک، سواری، مکان، عادات وخصائل سب وہی تھے جو شاہی حکومت میں شاہزادوں کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ماحول اُس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں انہوں نے انجام دیا۔ لیکن ان کی ماں حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پچاس ہی برس ہوئے تھے جب وہ پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں صحابہ اور تابعین بکثرت موجود تھے۔ ابتدا میں انہوں نے حدیث اور فقہ کی پوری تعلیم پائی تھی یہاں تک کہ محدثین کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے اور فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ پس علمی حیثیت سے تو اُن کے لئے یہ جاننے اور سمجھنے میں کوئی دقت نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین مہدیین کے عہد میں تمدن کی اساس کن چیزوں پر تھی اور جب خلافت بادشاہی سے بدلی تو ان بنیادوں میں کس نوعیت کا تغیر واقع ہوا۔ البتہ جو چیز عملی حیثیت سے اُن کے راستے میں رکاوٹ ہوسکتی تھی وہ یہ تھی کہ اس جاہلی انقلاب کا بانی خود ان کا اپنا خاندان تھا، اُس کے

[۱] ۶۱ھ میں پیدا ہوئے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

تمام فائدے اور بے حد وحساب فائدے اُن کے بھائی بندوں اور خود اُن کی ذات اور اُن کے بال بچوں کو پہنچتے تھے، اور اُن کی خاندانی عصبیت، ذاتی طمع اور اپنی آئندہ نسل کی دنیوی خیر خواہی کا پورا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی تختِ شاہی پر فرعون بن کر بیٹھیں، اپنے علم اور ضمیر کو ٹھوس مادی فائدوں کے مقابلہ میں قربان کریں اور حق، انصاف، اخلاق اور اصول کے چکر میں نہ پڑیں۔ مگر جب ۳۷ سال کی عمر میں بالکل اتفاقی طور پر تختِ شاہی ان کے حصّہ میں آیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ کس قدر عظیم الشان ذمہ داری ان پر آ پڑی ہے تو دفعتہً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے اس طرح کسی ادنیٰ تامل کے بغیر جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کے راستے کو اپنے لئے منتخب کیا کہ گویا یہ ان کا پہلے سے سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔

تخت شاہی انہیں خاندانی طریق پر ملا تھا مگر بیعت لیتے وقت مجمع عام میں صاف کہہ دیا کہ میں اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، تم لوگ جس کو چاہو خلیفہ منتخب کر لو۔ اور جب لوگوں نے برضا و رغبت کہا کہ ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں، تب انہوں نے خلافت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔

پھر شاہانہ کروفر، فرعونی انداز، قیصر و کسریٰ کے درباری طریقے، سب رخصت کئے اور پہلے ہی روز لوازم شاہی کو ترک کر کے وہ طرز اختیار کیا جو مسلمانوں کے درمیان اُن کے خلیفہ کا ہونا چاہئے۔

اس کے بعد ان امتیازات کی طرف توجہ کی جو شاہی خاندان کے لوگوں کو حاصل تھے اور ان کو تمام حیثیتوں سے عام مسلمانوں کے برابر کر دیا۔ وہ تمام جاگیریں جو شاہی خاندان کے قبضہ میں تھیں، اپنی جاگیر سمیت بیت المال کو واپس کیں۔

جن جن کی زمینوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا وہ سب ان کو واپس دیں۔ ان کی اپنی ذات کو اس تغیر سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچاس ہزار کی جگہ صرف دو سو اشرفی سالانہ کی آمدنی رہ گئی۔ بیت المال کے روپے کو اپنی ذات پر اور اپنے خاندان والوں پر حرام کر دیا حتیٰ کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تنخواہ تک نہ لی۔ اپنی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ یا تو خلیفہ ہونے سے پہلے شاہانہ شان کے ساتھ رہتے تھے، یا خلیفہ ہوتے ہی فقیر بن گئے۔

گھر اور خاندان کی اس اصلاح کے بعد نظام حکومت کی طرف توجہ کی۔ ظالم گورنروں کو الگ کیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر صالح آدمی تلاش کئے کہ گورنری کی خدمت انجام دیں۔ عاملین حکومت، جو قانون اور ضابطے سے آزاد ہو کر رعایا کی جان، مال، آبرو پر غیر محدود اختیارات کے مالک ہو گئے تھے، ان کو پھر ضابطہ کا پابند بنایا اور قانون کی حکومت قائم کی ٹیکس عائد کرنے کی پوری پالیسی بدل دی اور وہ تمام ناجائز ٹیکس جو شاہان بنی امیہ نے عائد کر دئے تھے، جن میں آبکاری تک کا محصول شامل تھا، یک قلم موقوف کئے۔ زکوٰۃ کی تحصیل کا انتظام از سر نو درست کیا اور بیت المال کی دولت کو پھر سے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی تھیں اُن سب کی تلافی کی، ان کے معابد جن پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا انہیں واپس دلائے، ان کی زمینیں جو غصب کر لی گئی تھیں پھر واگذاشت کیں اور ان کے تمام وہ حقوق بحال کئے جو شریعت کی رو سے انہیں حاصل ہیں۔ عدالت کو انتظامی حکومت کے دخل سے آزاد کیا اور حکم بین الناس کے ضابطہ اور اسپرٹ دونوں کو شاہی نظام کے

اثرات سے پاک کر کے اسلامی اصول پر قائم کر دیا۔ اس طرح حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے ہاتھوں سے اسلامی نظام حکومت دوبارہ زندہ ہوا۔

پھر انہوں نے سیاسی اقتدار سے کام لے کر لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی سے جاہلیت کے اُن اثرات کو نکالنا شروع کیا جو نصف صدی کی جاہلی حکومت کے سبب سے اجتماعی زندگی میں پھیل گئے تھے۔ فاسد عقیدوں کی اشاعت کو روکا۔ عوام کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کی طرف اہل دماغ طبقوں کی توجہات کو دوبارہ منعطف کیا اور ایک ایسی علمی تحریک پیدا کر دی جس کے اثر سے اسلام کو ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد ابن حنبل جیسے مجتہدین میسر آئے۔ اتباع شریعت کی روح کو تازہ کیا۔ شراب نوشی، تصویر کشی اور عیش و تنعم کی بیماریاں جو شاہی نظام کی بدولت پیدا ہو چکی تھیں، ان کا انسداد کیا اور فی الجملہ وہ مقصد پورا کیا جس کے لئے اسلام اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، یعنی اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

بہت ہی قلیل مدت میں اس انقلاب حکومت کے اثرات عوام کی زندگی پر اور بین الاقوامی حالات پر مترتب ہونے شروع ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ ولید کے زمانے میں لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو عمارات اور باغوں کے متعلق گفتگو کرتے سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو عوام کا مذاق صنفی معاملات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر جب عمر ابنِ عبدالعزیز حکمراں ہوئے تو حالت یہ تھی کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے نماز اور روزہ اور قرآن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ غیر مسلم رعایا پر اس حکومت کا اتنا زبردست

اثر ہوا کہ ہزار در ہزار آدمی اس مختصر سی مدت میں مسلمان ہو گئے اور جزیہ کی آمدنی دفعتہً اتنی گھٹ گئی کہ سلطنت کے الیات اس سے متاثر ہو گئے۔ مملکتِ اسلامی کے اطراف میں جو غیر مسلم ریاستیں موجود تھیں، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان میں سے متعدد ریاستوں نے اس دین کو قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی حریف سلطنت اس وقت روم کی سلطنت تھی جس کے ساتھ ایک صدی سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اُس وقت بھی سیاسی کشمکش چل رہی تھی۔ مگر عمر ابنِ عبدالعزیز کا جو اخلاقی اثر روم پر قائم ہوا اس کا اندازہ اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے انتقال کی خبر سُن کر خود قیصرِ روم نے کہے تھے۔ اس نے کہا کہ:۔

> "اگر کوئی راہب دنیا کو چھوڑ کر اپنے دروازے بند کر لے اور عبادت میں مشغول ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مگر مجھے حیرت ہے تو اس شخص پر جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور پھر اُسے ٹھکرا کر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔"

اسلام کے اس مجدّدِ اول کو صرف ڈھائی سال کام کرنے کا موقع ملا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے یہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا۔ بنی امیہ کا پورا خاندان اس بندۂ خدا کا دشمن ہو گیا تھا۔ اسلام کی زندگی میں اُن لوگوں کی موت تھی، وہ اس تجدید کے کام کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ آخرکار انہوں نے سازش کر کے زہر دیدیا اور صرف ۳۹ سال کی عمر میں یہ خادمِ دین و ملت دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جس کارِ تجدید کو اس نے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل میں اب

صرف اتنی کسر باقی تھی کہ خاندانی حکومت کو ختم کرکے انتخابی خلافت کا سلسلہ پھر سے قائم کردیا جاتا۔ یہ اصلاح اس کے پیشِ نظر تھی، اور اپنے عندیہ کا اس نے اظہار بھی کردیا تھا، مگر اُموی اقتدار کی جڑوں کو اجتماعی زندگی سے اکھاڑنا اور عام مسلمانوں کی اخلاقی و ذہنی حالت کو خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے تیار کرنا اتنا آسان کام نہ تھا کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پا سکتا۔

ائمۂ اربعہ

عمر ثانی کی وفات کے بعد اگرچہ سیاسی اقتدار کی کنجیاں پھر اسلام سے جاہلیت کی طرف منتقل ہوگئیں، اور سیاسی پہلو میں اس پورے کام پر پانی پھر گیا جو انہوں نے انجام دیا تھا، مگر اسلامی ذہنیت میں جو بیداری انہوں نے پیدا کردی تھی اور جس علمی حرکت کو وہ اُکسا گئے تھے اُسے کوئی طاقت بارآور ہونے سے نہ روک سکی۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے کوڑے اور اشرفیوں کے توڑے دونوں ہی اس کے راستے میں حائل ہوئے، مگر کسی کی بھی اس کے آگے پیش نہ چلی۔ اس تحریک کے اثر سے قرآن و حدیث کے علوم میں تحقیق، اجتہاد اور تدوین کا بہت بڑا کام ہوا، اصولِ دین سے اسلام کے قوانین کی تفصیلی شکل مرتب کی گئی اور ایک وسیع نظام تمدن کو اسلامی طرز پر چلانے کے لئے جس قدر ضوابط و مناہج عمل کی ضرورت تھی وہ تقریباً سارے کے سارے اپنے تمام جزئیات کے ساتھ مدون کر ڈالے گئے۔ دوسری صدی کے آغاز سے تقریباً چوتھی صدی تک یہ کام پوری قوت کے ساتھ چلتا رہا۔

اس دور کے مجدد دین وہ چار بزرگ ہیں[۵] جنکی طرف آج فقہ کے چاروں مذاہب منسوب ہیں۔ اگرچہ مجتہد ان کے سوا اور بھی کثیر التعداد اصحاب تھے۔ مگر جس لحاظ سے ان حضرات کا مقام مجتہدین سے بلند ہو کر مجدّدین کے مرتبہ تک پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

اوّلاً ان حضرات نے اپنی گہری بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت سے ایسے مذاہب فکر پیدا کئے جن کی زبردست طاقت سات آٹھ صدیوں تک مجتہد پیدا کرتی رہی۔ انہوں نے کلیات دین سے جزئیات مستنبط کرنے اور اصول شرح کو زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کے ایسے وسیع و ہمہ گیر طریقے قائم کر دئے کہ آگے چل کر جس قدر اجتہادی کام ہوا انہی کے طریقوں پہ ہوا اور آئندہ بھی جب کبھی اس سلسلہ میں کوئی کام ہوگا ان کی رہنمائی سے انسان بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

ثانیاً ان لوگوں نے یہ سارا کام شاہی نظام حکومت کی امداد کے بغیر، اس کی مداخلت سے بالکل آزاد ہو کر، بلکہ اس کی دراندازیوں کا سخت مقابلہ کر کے انجام دیا اور اس سلسلہ میں وہ وہ تکلیفیں اٹھائیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں کوڑوں کی مار اور قید کی سزائیں بھگتیں یہاں تک کہ زہر سے ان کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔ امام

---

[۵] امام ابوحنیفہ سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام مالک سنہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۷۹ھ میں وفات پائی امام شافعی سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۲۰۴ھ میں وفات پائی امام احمد ابن حنبل سنہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

مالک کو منصور عباسی کے زمانے میں ۷۰ کوڑوں کی سزا دی گئی اور اس بری طرح ان کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ امام احمد ابن حنبل پر مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانے میں مسلسل مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، اتنا اتنا مارا گیا کہ شائد اونٹ اور ہاتھی بھی اس مار کی تاب نہ لا سکیں، اور پھر متوکل کے زمانہ میں شاہی انعام و اکرام اور عقیدت و تعظیم کی وہ بارش اُن پر کی گئی کہ گھبرا کر پکار اٹھے کہ ھذا امر اشد علیٰ من ذالک (یہ مجھ پر اُس مار اور قید سے زیادہ سخت مصیبت ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود اِن اللہ کے بندوں نے علم دین کی ترتیب و تدوین میں نہ صرف خود شاہی نفوذ و اثر کو گھسنے کا راستہ نہ دیا بلکہ کچھ ایسی طرح ڈال گئے کہ ان کے بعد بھی سارا اجتہادی و تدوینی کام درباروں کے دخل سے بالکل آزاد ہی رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی قوانین اور علوم حدیث و قرآن کا جتنا معتبر و مستند ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ جاہلیت کے ادنیٰ شائبہ سے بھی ملوث نہیں ہوا ہے۔ یہ چیزیں ایسی پاک صاف صورت میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئی ہیں کہ صدیوں تک بادشاہوں اور امرا کی نفس پرستیوں اور عوام کے اخلاقی تنزل اور اعتقادی و تمدنی گمراہیوں کا جو دور دورہ رہا وہ گویا اِن علوم کے لئے معدوم محض تھا۔ اس کا کوئی اثر اِن علوم پر نہیں پایا جاتا۔

امام غزالی

عمر ابن عبدالعزیز کے بعد سیاست و حکومت کی باگیں مستقل طور پر جاہلیت

کے ہاتھوں میں چلی گئیں، اور بنی امیہ، بنی عباس اور پھر ترکی النسل بادشاہوں کا اقتدار قائم ہوا۔ ان حکومتوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفوں کو چن چن کا توں لیکر مسلمانوں میں پھیلا دیا، اور دوسری طرف علوم و فنون اور تمدن و معاشرت میں جاہلیت اولیٰ کی تمام گمراہیوں کو اپنی دولت اور طاقت کے زور سے شائع و ذائع کیا۔ عباسی خاندان کے تنزل نے مزید نقصان یہ پہنچایا کہ ابتدائی عباسی "خلفا" کے بعد دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے۔ ان میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ قضا اور افتار کے عہدوں کے لئے اہل آدمیوں کو منتخب کر سکتے۔ اپنی جہالت اور سہولت پسندی کی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کی تنفید کا کام ایسے لگے بندھے طریقوں پر کرنا چاہتے تھے جن میں کسی کد و کاوش کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے لئے تقلید جامد ہی کا راستہ موزوں تھا۔ مزید برآں دنیا پرست علمار نے ان کو مذہبی مناظروں کی چاٹ بھی لگا دی، اور پھر شاہی سرپرستی میں یہ مرض اتنا پھیلا کہ اس نے تمام مسلم ممالک میں فرقہ بندی، اختلاف اور سر پھٹول کی وبا پھیلا دی۔

پانچویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا کہ:۔

(۱) یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ محدثین و فقہار علوم عقلیہ سے ناواقف تھے اس لئے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقولی انداز سے سمجھا نہ سکتے تھے اور زجر و توبیخ سے اعتقادی گمراہیوں کو دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ علوم عقلیہ میں جن لوگوں کے کمال کا شہرہ تھا وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ میں کوئی بصیرت نہ رکھتے تھے، بلکہ فلاسفۂ یونان کے بالکل غلام تھے اور ان میں کوئی

ایسا بالغ النظر آدمی نہ تھا جو تنقید کی نگاہ سے اِس یونانی لٹریچر کا جائزہ لیتا۔ متکلمین کا جو گروہ اسلام کی "حمایت" کے لئے اٹھا اُس نے وحی یونانی کو تو اٹل سمجھ کر جوں کا توں تسلیم کر لیا، اور وحی آسمانی کو توڑنا اور مروڑنا شروع کیا تاکہ اس کے مطابق ڈھل جائے۔ ان حالات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ دین کو ایک غیر معقول چیز سمجھنے لگے، اس کی ہر چیز انہیں مشکوک نظر آنے لگی اور ان میں یہ خیال جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ ہمارا دین ایک چھوئی موئی کا درخت ہے، جو عقلی امتحان کی ایک ذراسی ٹھیس سے مرجھا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اور ان کے متبعین نے اس رو کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا، لیکن معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا، اس لئے وہ اس عام بے اعتقادی کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، بلکہ معتزلہ کی ضد میں اس نے بعض ایسی باتوں کا التزام کر لیا جو فی الواقع عقائد دین میں سے نہ تھیں۔

(۲) جاہل فرمانرواؤں کے اثر سے" اور علوم دینی کو مادّی وسائل کی تائید بہم نہ پہنچنے کے سبب سے اجتہاد کے چشمے خشک ہو گئے، تقلید جامد کی بیماری پھیل گئی مذہبی اختلافات نے ترقی کر کے ذرا ذرا سے جزئیات پر نئے نئے فرقے پیدا کر دئے۔ اور ان فرقوں کی باہمی لڑائیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا ـ علیٰ شفا حفرۃ من النار ہیں۔

(۳) مشرق سے مغرب تک مسلم ممالک میں ہر طرف اخلاقی انحطاط رونما ہو گیا۔ جس کے اثر سے کوئی طبقہ خالی نہ رہا۔ قرآن اور نبوت کی روشنی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بڑی حد تک خالی ہو گئی۔ علماء، امراء، عوام، سب بھول گئے کہ خدا کی

کتاب اور رسول کی سنت بھی کوئی چیز ہے جس کی طرف ہدایت و رہنمائی کے لئے کبھی رجوع کرنا چاہئیے۔

(۴) شاہی درباروں، خاندانوں، اور حکمراں طبقوں کی عیاشانہ زندگی اور خودغرضانہ لڑائیوں کی وجہ سے عموماً رعایا تباہ حال ہو رہی تھی۔ ناجائز ٹیکسوں کے بارنے معاشی زندگی کو نہایت خراب کر دیا تھا۔ تمدن کو حقیقی فائدہ پہنچانے والے علوم وصنائع رو بہ تنزل تھے اور اُن فنون کا زور تھا جو شاہی درباروں میں قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اخلاق و تمدن کے لئے غارت گر تھے۔ آثار سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عام تباہی کا وقت قریب آ لگا ہے۔

یہ حالات تھے جب پانچویں صدی کے وسط میں امام غزالی پیدا ہوئے[1]۔ انہوں نے ابتداءً اسی طرز کی تعلیم حاصل کی جو اس زمانہ میں دنیوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ انہی علوم میں کمال پیدا کیا جن کی بازار میں مانگ تھی۔ پھر اس جنس کو لیکر وہیں پہنچے جہاں کے لئے تیار ہوئے تھے اور اُن بلند ترین مراتب تک ترقی کی جنکا تصور اُس زمانہ میں کوئی عالم کر سکتا تھا، دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی — نظامیہ بغداد — کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ نظام الملک طوسی، ملک شاہ سلجوقی اور "خلیفہ" بغداد کے درباروں میں اعتماد حاصل کیا۔ وقت کے سیاسیات میں یہاں تک دخیل ہوئے کہ سلجوقی فرمانروا اور عباسی "خلیفہ" کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوتے تھے ان کو سلجھانے کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ دنیوی عروج کے اس نقطہ پر پہنچ جانے کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ اپنے زمانہ کی علمی اخلاقی

---

[1] ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

مذہبی، سیاسی اور تمدنی زندگی کو جتنی گہری نظر سے دیکھتے گئے اسی قدر ان کے اندر بغاوت کا جذبہ ابھرتا چلا گیا، اور اسی قدر ان کے ضمیر نے زیادہ زور سے صدا لگانی شروع کی کہ تم اس گندے سمندر کی شناوری کے لئے نہیں ہو بلکہ تمہارا فرض کچھ اور ہے۔ آخر کار اُن تمام اعزازات اور فوائد و منافع اور مشاغل پر لات ماری جن کے جنجال میں پھنسے ہوئے تھے، فقیر بن کر سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے، گوشوں اور ویرانوں میں رہ کر غور و خوض کیا، چل پھر کر عام مسلمانوں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا، اور مجاہدات و ریاضات سے اپنی روح کو صاف کرتے رہے۔ ۳۸ سال کی عمر میں نکلے تھے، پورے دس برس کے بعد ۴۸ سال کی عمر میں واپس ہوئے، اور اس طویل غور و فکر و مشاہدہ کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہوں کے تعلق اور ان کی وظیفہ خواری سے توبہ کی، جدال و تعصب سے پرہیز کرنے کا دائمی عہد کیا، اُن تعلیمی ادارات میں کام کرنے سے انکار کر دیا جو سرکاری اثر میں ہوں، اور طوس میں خود اپنا ایک آزاد ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ میں وہ چیدہ افراد کو اپنے خاص طرز پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کرنا چاہتے تھے۔ مگر غالباً ان کی یہ کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام نہ کر سکی کیونکہ پانچ چھ سال سے زیادہ ان کو اس طرزِ خاص پر کام کرنے کی اجل ہی نے مہلت نہ دی۔

امام غزالی کے تجدیدی کام کا خلاصہ یہ ہے: مینر ۱۵۲

اولاً، انہوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر تنقید کی اور اتنی زبردست تنقید کی کہ وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا، کم ہو گیا اور لوگ جن نظریات کو حقائق سمجھے بیٹھے تھے، جن پر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنے کے

سوا دین کے بچاؤ کی کوئی صورت انہیں نظر نہ آتی تھی، اُن کی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہو گئے۔ امام کی اس تنقید کا اثر مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفۂ یونان کے تسلط کو مٹانے اور جدید دورِ تنقید و تحقیق کا فتح باب کرنے میں حصّہ لیا۔

ثانیاً، انہوں نے ان غلطیوں کی اصلاح کی جو فلاسفہ و متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حامی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ اُسی قسم کی حماقتیں کر رہے تھے جو بعد میں یورپ کے پادریوں نے کیں، یعنی مذہبی عقائد کے اثبات کو بعض صریح غیر معقول باتوں پر موقوف سمجھ کر خواہ مخواہ اُن کو اصول موضوعہ قرار دے لیتے اور ان کو بھی عقائدِ دین میں داخل کر کے ہر اُس شخص کی تکفیر کرتے جو ان باتوں کا قائل نہ ہو، اور ہر اس بُرہان یا تجربہ یا مشاہدہ کو دین کے لئے خطرہ سمجھتے جس سے انکے مزعومات کی غلطی ثابت ہوتی ہو۔ اسی چیز نے یورپ کو بالآخر دہریت کی طرف دھکیل دیا۔ مگر مسلم ممالک میں امام غزالی نے بر وقت اس کی اصلاح کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے عقائد دینی کا اثبات ان غیر معقولات کے التزام پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے معقول دلائل موجود ہیں، لہٰذا ان چیزوں پر اصرار فضول ہے۔

ثالثاً، انہوں نے اسلام کے عقائد اور اساسیات (Fundamentals) کی ایسی معقول تعبیر پیش کی جس پر کم از کم اُس زمانہ کے اور بعد کی کئی صدیوں تک کے معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ احکام شریعت اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کئے اور دین کا ایک ایسا تصور لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جن کی بنا پر پہلے یہ گمان ہونے لگا

تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔

رابعاً، انہوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور ان کے اختلافات پر نظر ڈالی اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا کہ اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں، کن حدود کے اندر انسان کے لئے رای وتاویل کی آزادی ہے، اور کن حدود سے تجاوز کرنے کے معنی اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اسلام کے اصلی عقائد کون سے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کرلیا گیا ہے! اس تحقیقات نے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور تکفیر بازی کرنے والے فرقوں کی سرنگوں سے بہت سی بارودت نکال دی اور لوگوں کے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔

خامساً، انہوں نے دین کے فہم کو تازہ کیا، بے شعوری کی مذہبیت کو فضول ٹھیرایا، تقلید جامد کی سخت مخالفت کی، لوگوں کو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف پھر سے توجہ دلائی، اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی، اور اپنے عہد کے تقریباً ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کرکے اصلاح کی طرف عام دعوت دی۔

سادساً، انہوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی جو بالکل فرسودہ ہوچکا تھا اور تعلیم کا ایک نیا نظام تجویز کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں جو نظام تعلیم قائم تھا اُس میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ علوم دنیا اور علوم دین الگ الگ تھے اور اس کا نتیجہ لامحالہ تفریق دنیا ودین کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے شرعی علوم کی حیثیت سے بعض ایسی چیزیں داخل درس تھیں جو شرعی اہمیت نہ رکھتی تھیں، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دین کے

متعلق لوگوں کے تصورات غلط ہو رہے تھے اور بعض غیر جنس کی چیزوں کو دینی اہمیت حاصل ہو جانے کی وجہ سے فرقہ بندیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ امام غزالی نے ان خرابیوں کو دور کر کے ایک سمویا ہوا نظام بنایا جس کی ان کے ہم عصروں نے سخت مخالفت کی مگر بالآخر تمام مسلم ممالک میں اس کے اصول تسلیم کر لئے گئے اور جتنے نئے نظامات تعلیم بنے وہ تمام تر انہی خطوط پر بنے جو امام نے کھینچ دئے تھے، اِس وقت تک مدارس عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے اس کی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہینِ منت ہے۔

سابعاً، انہوں نے اخلاق عامّہ کا پورا جائزہ لیا۔ انہیں علماء، مشائخ، امراء، سلاطین، عوام، سب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خوب مواقع ملے تھے، خود چل پھر کر مشرقی دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھ چکے تھے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ ان کی کتاب احیاء العلوم ہے جس میں انہوں نے ہر طبقہ کی اخلاقی حالت پر تنقید کی ہے، ایک ایک برائی کی جڑ اور اس کے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا ہے، اور اسلام کا صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ثامناً، انہوں نے اپنے عہد کے نظامِ حکومت پر بھی پوری آزادی کے ساتھ تنقید کی براہ راست حکام وقت کو بھی پیہم اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے اور عوام میں بھی یہ روح پھونکنے کی کوشش کی کہ منفعلانہ انداز سے جبر و ظلم کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کریں بلکہ آزادانہ نکتہ چینی کریں۔ احیاء میں ایک جگہ صاف لکھتے ہیں کہ "ہمارے زمانہ میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں"۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیئے، نہ ان کی دیکھنی چاہیئے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ انکے

ظلم سے بغض رکھے، ان کے بقا کو پسند نہ کرے، ان کی تعریف نہ کرے، ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور ان کے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے"۔ ایک اور جگہ ان آدابِ پرستش و عبودیت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جو درباروں میں رائج تھے۔ اس معاشرت کی مذمت کرتے ہیں جو بادشاہوں اور امراء نے اختیار کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے محلات، ان کے لباس، ان کی آرائش، ہر چیز کو نجس بتلاتے ہیں! اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے اپنے عہد کے بادشاہ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اس کو اسلامی طرزِ حکومت کی طرف دعوت دی، حکمرانی کی ذمہ داریاں سمجھائیں، اور اسے بتایا کہ تیرے ملک میں جو کچھ ظلم ہو رہا ہے خواہ تو خود کرے یا تیرے عمال کریں، بہرحال اس کی ذمہ داری تجھ پر ہے۔ ایک دفعہ مجبوراً دربارِ شاہی میں جانا پڑا تو دورانِ گفتگو میں بادشاہ کے منہ در منہ کہا کہ:-

"تیرے گھوڑوں کی گردن سازِ زریں سے نہ ٹوٹی تو کیا ہوا، مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی"۔

اسی طرح ان کے آخری زمانہ میں جتنے وزرا سلطنت کے مدبر امر ہوئے ان سب کو بھی امام نے پیہم خطوط لکھے اور رعایا کی تباہ حالی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک وزیر کو لکھتے ہیں:-

"ظلم حد سے گذر چکا ہے۔ چونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا اس لئے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تاکہ بے رحم و بے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں"۔

ابنِ خلدون کے بیان سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کے

قیام کے خواہاں تھے جو خالص اسلامی اصول پر ہو، خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو۔ چنانچہ مغرب اقصیٰ میں موحدین کی سلطنت انہی کے اشارہ سے ان کے ایک شاگرد نے قائم کی۔ مگر امام موصوف کے کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا سیاسی انقلاب کے لئے انہوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھائی، نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے۔ اسی لئے جاہلیت کی حکمرانی میں مسلمان قوموں کی حالت برابر خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک صدی بعد تاتاری طوفان کے دروازے ان پر ٹوٹ پڑے اور اس نے ان کے پورے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے اُن کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم اُن نقائص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے۔ اور تیسری قسم اُن نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو جانے کی وجہ سے تھے۔ ان کمزوریوں سے بچ کر امام موصوف کے اصل کام، یعنی اسلام کی ذہنی و اخلاقی روح کو زندہ کرنے اور بدعت و ضلالت کی آلائشوں کو نظامِ فکر و نظامِ تمدن سے چھانٹ چھانٹ کر نکالنے کا کام جس شخص نے انجام دیا وہ ابنِ تیمیہ تھا۔

ابنِ تیمیہ

امام غزالی کے ڈیڑھ سو برس بعد ساتویں صدی کے نصف آخر میں امام ابنِ تیمیہ پیدا ہوئے[1]۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دریائے سندھ سے فرات کے کناروں تک تمام مسلمان

---

[1] ولادت ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ - وفات ۷۲۸ھ -

قوموں کو تا تاری غارت گر پامال کر چکے تھے اور شام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسلسل پچاس برس کی ان شکستوں نے، دائمی خوف و بدامنی کی حالت نے، اور علم و تہذیب کے تمام مرکزوں کی تباہی نے مسلمانوں کو اُس مرتبۂ پستی سے بھی بہت زیادہ نیچے گرا دیا تھا جس پر امام غزالی نے انہیں پایا تھا۔ نئے تاتاری حملہ آور اگرچہ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، مگر جاہلیت میں یہ حکمراں اپنے پیش رو ترکی فرمانرواؤں سے بھی کئی قدم آگے تھے۔ ان کے زیرِ اثر آ کر عوام اور علماء و مشائخ اور فقہاء و قضاۃ کے اخلاق اور بھی زیادہ گرنے لگے۔ تقلیدِ جامد اس حد کو پہنچ گئی کہ مختلف فقہی و کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے۔ اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا۔ بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کر لی۔ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ایسا گناہ ہو گیا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں جاہل و گمراہ عوام، دنیا پرست یا تنگ نظر علماء اور جاہل و ظالم حکمرانوں کی ایسی سنگت بن گئی تھی کہ اس اتحادِ ثلاثہ کے خلاف کسی کا اصلاح کے لئے اٹھنا اپنی گردن کو قصاب کی چھری کے سامنے پیش کرنے سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گو اس وقت صحیح الخیال، وسیع النظر، حقیقت شناس علماء بالکل نہ تھے، نہ اُن سچے اور اصلی صوفیوں کی کمی تھی جو جادۂ حق پر گامزن تھے، مگر جس نے اس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اٹھانے کی جرأت کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔

ابن تیمیہ حدیث کے امام تھے یہاں تک کہ کہا گیا کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیہ فلیس بحدیث (جس حدیث کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے)۔ تفقہ کی شان یہ تھی کہ بلاشبہ ان کو مجتہد مطلق کا مرتبہ حاصل تھا۔ علومِ عقلیہ منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی گہری نظر تھی کہ جن لوگوں کا سرمایۂ ناز یہی علوم تھے

وہ اُن کے سامنے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس پر جرأت وہمت کا یہ حال تھا کہ اظہار حق میں کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہ ڈرے، حتیٰ کہ متعدد مرتبہ جیل بھیجے گئے اور آخر کار جیل ہی میں جان دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امام غزالی کے چھوڑے ہوئے کام کو ان سے زیادہ خوبی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے تجدیدی کارنامہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) انہوں نے یونانی منطق وفلسفہ پر امام غزالی سے زیادہ گہری اور زبردست تنقید کی اور اس کی کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کرکے رکھ دیا کہ عقلیات کے میدان پر اس کا تسلط ہمیشہ کے لئے ڈھیلا ہو گیا۔ ان دونوں اماموں کی تنقید کے اثرات مشرق ہی تک محدود نہ رہے بلکہ مغرب تک بھی پہنچے۔ چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور مسیحی متکلمین کے یونان زدہ فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز ابنِ تیمیہ کے ڈھائی سو برس بعد اٹھی۔

(۲) انہوں نے اسلام کے عقائد، احکام، اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کئے جو امام غزالی کے دلائل سے زیادہ معقول بھی تھے اور اسلام کی اصلی روح کے حامل ہونے میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ امام غزالی کے بیان واستدلال پر اصطلاحی معقولات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ابنِ تیمیہ نے اس راہ کو چھوڑ کر عقلِ عام (Commonsense) پر تفہیم وتبیین کی بنا رکھی جو زیادہ فطری، زیادہ مؤثر اور زیادہ قرآن وسنت کے قریب ہے۔ یہ نئی راہ پچھلوں کی راہ سے بالکل الگ تھی۔ جو لوگ دین کے علمبردار تھے وہ فقط احکام نقل کر دیتے تھے، تفہیم نہ کر سکتے تھے۔ اور جو کلام میں پھنس گئے تھے وہ تفلسف اور اصطلاحی معقولات کو ذریعۂ

تفہیم بنانے کی وجہ سے کتاب و سنت کی اصلی اسپرٹ کو کم و بیش کھو دیتے تھے۔ ابن تیمیہ نے عقائد و احکام کو ان کی اصلی اسپرٹ کے ساتھ بے کم و کاست بیان بھی کیا اور پھر تفہیم کا وہ سیدھا سادہ فطری ڈھنگ اختیار کیا جس کے سامنے اہل عقل کے لئے سر جھکا دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اسی زبردست کارنامے کی تعریف امام حدیث علامہ ذہبی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ولقد نصر السنة المحضة والطريقة السلفية واحتج لها ببراهين ومقدمات وامور لم يسبق اليها یعنی ابن تیمیہ نے خالص سنت اور طریقہ سلف کی حمایت کی اور اس کی تائید میں ایسے دلائل اور ایسے طریقوں سے کام لیا جن کی طرف ان سے پہلے کسی کی نظر نہ گئی تھی۔

(۳) انہوں نے تقلید جامد کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ قرون اولی کے مجتہدین کے طریقہ پر اجتہاد کرکے دکھایا۔ براہ راست کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے استنباط کرکے، اور مختلف مذاہب فقہیہ کے درمیان آزادانہ محاکمہ کرکے، کثیر التعداد مسائل میں کلام کیا، جس سے راہ اجتہاد از سر نو باز ہوئی اور قوت اجتہادیہ کا طریق استعمال لوگوں پر واضح ہوا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اور ان کے جلیل القدر شاگرد ابن قیم نے حکمت تشریع اور شارع کے طرز قانون سازی پر اتنا نفیس کام کیا جس کی کوئی مثال ان سے پہلے کے شرعی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ یہ وہ مواد ہے جس سے ان کے بعد اجتہادی کام کرنے والوں کو بہترین رہنمائی حاصل ہوئی اور آئندہ ہوتی رہے گی۔

(۴) انہوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ اسلام کے چشمہ

صافی میں اُس وقت تک جتنی آمیزشیں ہوئی تھیں، اُس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا، ایک ایک کی خبر لی، اور ان سب سے چھانٹ کر ٹھیٹھ اسلام کے طریقہ کو الگ روشن کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس تنقید و تنقیح میں اُس شخص نے کسی کی رو رعایت نہ کی۔ بڑے بڑے آدمی، جن کے فضل و کمال کا اور تقدس کا سکہ مسلمانوں کی ساری دنیا پر بیٹھا ہوا تھا، جن کے نام سن کر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں، ابن تیمیہ کی تنقید سے نہ بچ سکے۔ وہ طریقے اور اعمال جو صدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے، جن کے جواز، بلکہ استحباب کی دلیلیں نکال لی گئی تھیں، اور علمائے حق بھی جن سے مداہنت کر رہے تھے، ابن تیمیہ نے ان کو ٹھیٹھ اسلام کے منافی پایا اور ان کی پر زور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا ان کی دشمن ہوگئی اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ ان کے عہد میں تھے انہوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوایا۔ اور جو بعد میں آئے انہوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص و محض کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا اس کی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہوگئی جس کی آواز بازگشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

اس تجدیدی کام کے ساتھ انہوں نے تاتاری وحشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس وقت مصر و شام اس سیلاب سے بچے ہوئے تھے۔ امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی اور انہیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ ان کے ہم عصر شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں جاتے ہوئے

یوں ڈستے تھے کا نما یسا قون الی الموت۔ مگر ابن تیمیہ نے ان میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آئیں۔

شیخ احمد سرہندی

ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے ہند وکش سے اُس پار کی دنیا کو تو بالکل تاخت وتاراج کر دیا مگر ہندوستان اس کی دست بُرد سے بچ گیا تھا۔ اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اُسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دنیا کو لاحق ہوتی ہے۔ یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان وعراق میں تھیں۔ وہی بادشاہوں کی خداوندی، وہی امراء واہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل راستوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر وظلم کی حکومت، وہی خدا سے غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے بُعد۔ رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دور حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی مہذب وشائستہ قوم کے لئے وہ موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر ونشر، دوزخ وجنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب وعذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن واقرب الی الصواب۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبوی پر اعتراضات

کئے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے غزوات و سرایا پر۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمدؐ سے بھی بیزاری ہو گئی اور جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا ان کے نام بدلے جانے لگے۔ دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے، العیاذ باللہ، العیاذ باللہ۔ دیوان خانہ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابوالفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے شعائر دینی پر سخت اعتراضات کئے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک بھی پہونچی۔

بہائی نظریہ کی بنا بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی۔ اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گذر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اس لئے اب وہ منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکّوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے اس قسم کی پیشنگوئیاں سنانی شروع کر دیں کہ فلاں زمانہ میں ایک گئو رکھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہو گا۔ اور اسی طرح بندۂ زر علماء نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک "تاج العارفین" صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں

ہونے کی حیثیت سے خدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا۔ عوام کو سمجھانے کے لئے کہا گیا کہ "حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں، کوئی ایک ہی دین حق کا اجارہ دار نہیں ہے، لہٰذا سب مذہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیئے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت عام دینی چاہیئے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں، اسی طریق جامع کا نام دین الٰہی ہے" اس نئے دین کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دین اسلام مجازی وتقلیدی کہ از پدراں دیدہ وشنیدہ ام" سے توبہ کرکے "دین الٰہی اکبر شاھی" میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا "اللہ اکبر" اور جواب دینے والا جل جلالہ کہتا (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا) چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا، اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علماء کرام اور صوفیانِ باصفا، دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات وکعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جس کی پیشینگوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اسکو حلال کر لیا کرینگے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلا کسی تعصب کے ہر مذہب

کی اچھی باتیں لی جائیںگی، مگر در اصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت و عداوت کے لئے صرف اسلام اور اس کے احکام و قوانین ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی کی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور تماشائے صورت ثالث ثلاثہ اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں۔ سب سے زیادہ نظر عنایت ہندویت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب تھا اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس کی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تہوار۔ دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ھون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو جلّت قدرتہٗ کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیوڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں سے ان کے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے۔ یہ سارا معاملہ تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اس کے معاملہ میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اس سے ضد اور چڑ ہوگئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر ذرا فلسفیانہ وصوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اسے وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا اور اس کے مقابلہ میں اسلامی تعلیم رد کر دیجاتی۔ علمائے اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے،

یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں "فقیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا جس کے معنی اُن کی اصطلاح خاص میں احمق اور نا قابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لئے مقرر کی گئی تھی جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدتمندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اُس کا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اس کی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام میں دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر شراب کا استعمال ضروری تھا حتیٰ کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اس کے جواز پر دلائل قائم کئے گئے۔ چچا زاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھیرایا گیا۔ لڑکے کے لئے ۱۶ سال اور لڑکی کے لئے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ حدِ زنا نہ صرف موقوف کی گئی بلکہ چند ضوابط کے ساتھ زنا کو قانوناً جائز ٹھیرایا گیا۔ ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کی ممانعت کر دی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑئیے کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا، حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اس کو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنیکے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھیرایا گیا، اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی عربی

زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کئے جاتے۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفۂ ریاضی و تاریخ اور اسی نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہلِ علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے اُن کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اس لئے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لئے ہوئے تھے۔ اِن دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جلکر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا جس کا نام "اسلامی تمدن" تھا۔ اس میں شرک بھی تھا۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے، اوہام و خرافات بھی تھے، اور نوایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوط سے موافقت کر لی تھی، بلکہ وہ اس نئے مت کے پروہت بن گئے تھے۔ لوگوں کی طرف سے اُن کو نذرانے پہنچتے، اور اُن کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی۔ اشراقیت، رواقیت (Stoicism) اور ویدانتزم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے نظامِ اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا

گیا تھا۔ طریقت و حقیقت، شرع اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کوچہ کا قانون یہ تھا کہ حدود حلال و حرام رخصت، احکام دین عملاً منسوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلی اختیارات، جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے، جس حلال کو چاہے حرام کر دے اور جس حرام کو چاہے حلال کر دے۔ ان عام پیروں سے بہتر جن کی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش اس فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بیکار کر دیا تھا۔

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے[۵]۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے، گو اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان و عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال یہ تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ:۔

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے

۵:۔ پیدائش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء۔ وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء۔

بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اس دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اُس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دیگا"

یہ پیشنگوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علما اور سچے صوفیہ بھی اُس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لئے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یک وتنہا احیار دین کی جد وجہد کی۔ اس بے سرو سامان فقیر نے علی الاعلان اٹھ کر ان گمراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی، اور اُس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اسکو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا، مگر بالآخر وہ فتنہ کا منہ پھیر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جہانگیر، جس نے سجدۂ تحیۃ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیج دیا تھا آخر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اور اپنے بیٹے خرّم کو، جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا، اُن کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی" دینِ الٰہی اکبر شاہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہو گئی۔ حکومت اگرچہ شاھی حکومت ہی رہی، مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اُس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہو گیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار ہی سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری

خاندان کے اُس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پرپوتا خادم شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دئے۔ ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو اُن آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اُس میں سرایت کرگئی تھیں، پاک کرکے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ اُن تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اُس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت وارشاد کے ذریعہ سے اتباعِ شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جس کے ہزارہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں، بلکہ وسط ایشیا تک پہنچ کر عوام کے اخلاق اور عقائد کی اصلاح کے لئے کوشش کی۔ یہی کام ہے جس کی وجہ سے شیخ سرہندی کا شمار مجدّدین ملت میں ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۸۰ سال بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے[1]۔ ایک

---

[1] پیدائش ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء ۔ وفات ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء ۔

طرف اُن کے زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف اُن کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانہ میں نشو ونما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظرِ عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے، اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جس کی زبان، اندازِ بیان، خیالات، نظریات، موادِ تحقیق اور نتائجِ مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اُس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد و پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و غارت، جبر و ظلم اور بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالاتِ موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی، اور تعمیرِ نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کر کے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریبِ فاسد و تعمیرِ صالح کے لئے ایک تحریک اٹھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی عملی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لئے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ

تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں، اذہان میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں، زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصلی اور پائدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیتوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے اگرچہ شاہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کرکے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا[1] مگر واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیالات کی دنیا میں ان کا انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ خود اُن کے اپنے گھر اور اُن کے قریبی حلقہ میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ ان کی اصلاح پر بھی توجہ صرف کرنے سے معذور رہے۔ مثلاً السلام علیکم تک کا رواج اُن کے گھر میں نہ تھا "رفیع الدین آداب بجا لاتا ہے۔۔" "عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے" سلام مسنون کے بجائے اس قسم کے فقرے بولے

---

[1] :۔ تفہیمات جلد اول ص ۱۰۱ : فلو فرض ان یکون ھذا الرجل فی زمان واقتضت الاسباب ان یکون اصلاحہ الناس باقامۃ الحروب ونفث فی قلبہ اصلاحھم لقام ھذا الرجل بامر الحرب اتم قیام وکان اماماً فی الحرب لا یقاس بالرستم والاسفندیار بل الرستم والاسفندیار وغیرھما طفیلیون علیہ مستمدون منہ معتدون بہ۔

جاتے تھے۔ شاہ صاحب کی پوتی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی جوان بیوہ بیٹھی ہوئی تھیں اور نکاح ثانی میں انہیں اس لئے تامل تھا کہ ہندوانہ جاہلیت اسے معیوب سمجھتی تھی۔ بی بی کی صحنک اور اسی قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا[1]۔ یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو تنقید و تعمیر افکار کے بھاری کام نے بالکل اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور ان کو اس کارِ عظیم سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف ہی توجہ کر سکتے۔ جیسا کہ آگے چل کر عرض کیا جائیگا، اُن کے صاف کئے ہوئے راستہ پر عملی جد و جہد کرنے کے لئے کچھ دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی! ور وہ نصف صدی کے اندر خود اُنہی کے حلقہ تعلیم و تربیت سے نشو و نما پا کر اٹھے۔

---

[1] :۔ مولانا محمد منظور صاحب مدیر "الفرقان" نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں۔ مجھے اِن کے صحیح ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجائے خود حقیقت ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوتِ علمہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا تطہیر و تعمیر فکر اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کام ہے اور دعوتِ عامہ کا کام اس سے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے! ور اگر کسی شخص نے صرف پہلا کام کیا ہو اور دوسرا کام نہ کر سکا ہو تو اس سے اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں ایک عنوان تنقید و تنقیح کا، اور دوسرا عنوان تعمیر کا۔ میں ان دونوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔

پہلے عنوان کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جس کی پیچیدگیوں میں پہلے بھی لوگ الجھے رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب کے بعد بھی کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جس کے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا، تاریخ مسلمین سے الگ، کوئی واضح تصور ہوتا۔ شاہ صاحب کے کلام میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق اشارات موجود ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ ازالۃ الخفا[له] کی فصل ششم میں انہوں نے صفحہ ۱۲۲ سے صفحہ ۱۵۸ تک مسلسل تاریخ مسلمین پر تبصرہ کیا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانہ کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشنگوئیوں کو بھی نقل کرتے گئے ہیں جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں اس تبصرہ میں قریب قریب اُن تمام جاہلی آمیزشوں کی نشان دہی ہو گئی ہے، جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہی ہیں۔
پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی

له :- میرے پیش نظر سنہ ۱۲۸۶ھ کا نسخہ ہے جو بریلی میں طبع ہوا ہے۔

کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن سے باقی تمام خرابیوں کا شجرۂ نسب ملتا ہو، اور آخر کار دو چیزوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت سے پادشاہی کی طرف انتقال، دوسرے روح اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔

پہلی خرابی پر انہوں نے ازالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ خلافت اور پادشاہی کے اصولی و اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں انہوں نے بیان کیا ہے اور جس طرح احادیث سے اس کی تشریح کی ہے، اس کی کوئی مثال ان سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی! اسی طرح اس انقلاب کے نتائج کو بھی جس صراحت کے ساتھ انہوں نے پیش کیا ہے وہ اگلوں کے کلام میں مفقود ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ارکان اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا۔ . . . حضرت عثمانؓ کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامتِ حج خلافت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہانِ گذشتہ کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لئے علامت پادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے خلیفہ کی اجازت کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز تھا۔ مگر

اس انقلاب کے بعد وعظ اور فتوٰی دونوں اس نگرانی سے آزاد ہوگئے بلکہ بعد میں تو فتوٰی دینے کے لئے جماعت صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی "

پھر فرماتے ہیں :

" اِن لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدائے تعالےٰ کیا دکھانا چاہتا ہے "

رہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدور بازغہ میں، تفہیمات میں، مسوّٰی، اور مصفّٰی میں، اور قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے ازالہ میں فرماتے ہیں :۔

" دولتِ شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا، بلکہ سب لینے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقہ پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔

دولتِ عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معیّن کیا اور یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب وسنت کی دلیل پر حکم نہ کرتے۔ اس طرح وہ اختلافات جو تاویل کتاب وسنت کے مقتضا سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے مضبوط بنیادوں پر جم گئے۔ پھر جب دولت عرب کا خاتمہ ہوگیا (یعنی ترکی اقتدار کا

زمانہ آیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اُسی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مذہب مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع "

مصفی میں لکھتے ہیں :۔

"ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ اِن کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔ یہ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لئے مکلف ہی نہیں ہیں"

حجت کے مبحث ہفتم میں اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشان دہی کی ہے جو اسکی بدولت پیدا ہوئیں۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانہ کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کو نام بنام پکار کر اس کے نقائص بیان کرتے ہیں۔ تفہیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ لوگوں میں تین چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں :

(۱) دلیل بازی، اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث میں مشغول ہو گئے ہیں یہاں تک کہ عقائد میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوتی جو استدلالی مناظرات سے خالی ہو۔

(۲) وجدان پرستی، اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور انکی حلقہ بگوشی

کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے، یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔ ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو وہ نہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے۔ منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو، اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے، ورنہ اس کا شمار گدھوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امراء و رؤساء وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں جن کے ہاں لطف کلام اور بذلہ سنجی اور تفنن طبع کے لئے صوفیہ کے اشعار اور نکات کھلونا بنے ہوئے نہ ہوں۔

(۳) طاعت، اور یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ ملّت اسلامیہ میں داخل ہیں۔ پھر اس زمانہ کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگٹٹ چلا جا رہا ہے، نہ متشابہات پر جا کر رکتا ہے اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ و مباحثہ کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی، شافعی وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے

طریقہ پر اعتراض کرتا ہے، ہر مذہب میں تجزیات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے "

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

" میں ان پیرزادوں سے، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے۔ اور کیوں اس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپکو ھادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، یا اس لئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی حاصل کریں یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں۔ یہ سب رہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں ....

میں اُن طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علما رکھتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے، یا وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو .... تم پچھلے فقہاء کے

استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ "صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین و ماہرین کا کام ہے، اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی، پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا۔" جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف.....

میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا، حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنا لیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں...

میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے۔ زنا کاری، شراب خواری اور قمار بازی کے اڈے بر سر عام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔

اس عظیم الشان ملک میں مدتہائے دراز سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی۔ جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا۔ . . . . .

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو تو اللہ نے جہاد کے لئے، اعلائے کلمۂ حق کے لئے، شرک و اہل شرک کا زور توڑنے کے لئے بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنا لیا۔ اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں۔ پیسہ کمانے کے لئے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو۔ ڈاڑھیاں منڈاتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو! اور تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی۔ خدا کی قسم تمہیں ایک روز دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمہیں بتائے گا کہ کیا کر کے آئے ہو۔ . . . . . .

میں ان اہلِ حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی ہے، اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم غیر اللہ کے لئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو۔ یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے وہ اپنے لباس اور

کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی اور اہل وعیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاو دونوں کو ضائع کرتا ہے ......

پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کرکے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دئے، تم پر تنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمہیں مزا آتا ہے، اور حلال تمہارے لئے بدمزہ بن گیا ہے........... اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً روز عاشورار کو تم جمع ہو کر باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسین رضی اللہ عنہٗ اس روز شہید کئے گئے تو اور کونسا دن ہے جس میں کسی محبوبِ خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مُردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیئے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لئے کوئی دلیل لاؤ۔ پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے،

مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایت صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے، حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اس طریقہ پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی۔ پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے، گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقربا خوب کھانے کھلائیں۔ تم نمازوں سے غافل ہو، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔ تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ سے بھی غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لئے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں.....“

ایک اور تفہیم میں فرماتے ہیں:۔

”جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لئے اجمیر جا یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے

ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا
گناہ اس سے کم تر ہے۔ آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں
فرق کیا ہے؟ جو لوگ لات اور عُزّیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے اُن کا
فعل اِن لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ
ہم اُن کے برعکس ان لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے
ہیں کیونکہ خاص ان کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے۔ مگر اصولاً
ہر وہ شخص جو کسی مُردے کو زندہ ٹھیرا کر اُس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اُسکا
دل گناہ میں مبتلا ہے"

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں، مگر تفہیمات جلد دوم کے چند فقرے اور نقل کیا جا رہا ہے
کر رہے ہیں کہ ان کو بھی اس سلسلہ میں ناظرین تک پہنچا دیا جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی
امتوں کے طریقے اختیار کر لوگے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے
وہاں تم بھی قدم رکھوگے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی
اُن کے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ پہلی امتوں سے آپ کی
مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری
اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ
ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنا لیا
ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔

ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گنا ہگار میرے لئے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لئے)۔ سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلۂ توحید میں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں، مثلاً وہ در دہ کا مسئلہ[1] اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ[2]۔ رہے اصحاب معقول اور شعراء اور اصحاب ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔"

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ اُن پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جن کے ضمیر و ایمان میں زندگی اور جن کے قلب میں برے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے ان کی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر

---

[1] :- یعنی یہ مسئلہ کہ دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا حوض ہو تب اس کا پانی ماء کثیر ہوگا۔

[2] :- یعنی یہ مسئلہ کہ کنویں میں کس جانور کے گرنے پر کتنے ڈول پانی کے نکالے جائیں۔

اثر انہیں کھٹکنے لگتا ہے۔ ان کی قوتِ امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کی قوت ایمانی اسقدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خار زارِ جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں اصلاح کے لئے بے چین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مجدّد کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے۔ تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے اُس پر وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اُسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو انکے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں

تعمیر کے سلسلہ میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی ایک مذہب کی جانب داری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح انہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی، اس بناء پر کی کہ دلیل اس کے حق میں پائی، نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں۔ اور جس سے اختلاف کیا، اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی، نہ اس بنا پر کہ انہیں اُس سے عناد ہے۔ اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی۔ انہوں نے اُن لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کریں گے۔ اور اسی طرح وہ اُن سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے ائمۂ مذاہب میں سے

کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے۔ اِن دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا رسالہ انصاف اس مسلک کا آئینہ ہے۔ یہی رنگ مصفیٰ اور ان کی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ تفہیمات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں سب سے زیادہ پیرو بھی انہی دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہاء محدثین، مفسّرین متکلمین اور صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں۔ اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملاءِ اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیثِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انہیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے۔ اور اگر ان میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کئے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرأت کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی

مخمصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے تعدد کفارات یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاءاللہ تعالیٰ نہ پایا جائے گا۔"

الانصاف میں انہوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دی ہے چنانچہ باب سوم میں واعلم ان التخریج علی کلام الفقہاء سے لیکر آخر باب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اہل الحدیث اور اہل تخریج دونوں اس کو غور کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس بحث میں انھوں نے جس طریقہ کو ترجیح دی ہے، وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج، دونوں کو جمع کیا جائے! اسی طرح حجت کے مبحث ہفتم میں فصل ومما یناسب ھذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیہا الافہام کے تحت جو بحث کی ہے وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔

یہ مسلک معتدل اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور لاطائل بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب ان کی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر اکسایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصفی کے مقدمہ سے چند فقرے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

"اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ ومراد از اجتہاد اینجا..... معرفت احکام شرعیہ از ادلہ تفصیلیہ و تفریع و ترتیب مجتہدانہ اگرچہ بارشاد صاحب مذہبے بودہ باشد۔ وآنکہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض است، بجہت آنست

کہ مسائل کثیرۃ الوقوع غیر محصور اند، و معرفت احکام الٰہی درانہا واجب، وآنچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و درانہا اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حل اختلاف آں نتواں کرد، و طرق آں تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعد اجتہاد راست نیاید۔"

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو، بلکہ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط کو بیان بھی کیا ہے، ازالہ، حجت، عقد الجید، انصاف، بدور بازغہ، مصفی وغیرہ میں اس مسئلہ پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انہوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو کی ہے ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے، گویا اُن کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی کو نہ صرف اجتہاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس کی تربیت بھی مل جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کئے ہیں، مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیش رووں سے بازی لے گئے ہیں، اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گذرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں، اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت

ِطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ
ہ کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی
یں۔ ان کی کتابوں میں سے حجۃ اللہ اور البدور البازغہ، دونوں کا موضوع یہی ہے۔
لی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔

ان کتابوں میں انہوں نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور تاریخ
ں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفۂ اسلام کو مدون کرنے کی بنا ڈال رہا ہے۔
س سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں
نے "فلسفۂ اسلام" کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفۂ اسلام نہیں فلسفۂ
مسلمین ہے جس کا شجرۂ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے
فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اس کی داغ بیل سب سے پہلے
اسی دھلوی شیخ نے ڈالی ہے۔ اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفۂ و کلام یا فلسفیانہ
تصوف کی زبان سے لی ہیں، اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے
آ گئے ہیں، جیسا کہ اوّل اوّل ہر نئی راہ نکالنے والے کے لئے طبعاً ناگزیر ہے، مگر
پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے،
خصوصاً ایسے شدید انحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل
حیرت انگیز ہے۔

اس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات کا اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا
تصور قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظام اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ
و متحد المزاج ہو سکتا ہو، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرۂ اسلام کی جڑ قرار دیا

جائے تو جڑیں اور اُس درخت میں جو اُس سے پھوٹا، عقلاً کوئی فطری مبائنت محسوس نہ کی جاسکتی ہو — میں حیران رہ جاتا ہوں جب سنتا ہوں کہ شاہ صاحب نے ویدانتی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا جوڑ لگا کر نئی ہندی قومیت کے لئے فکری اساس فراہم کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی کتابوں میں اس کوشش کا کہیں سراغ نہ ملا، اور اگر مل جاتا تو باللہ العظیم کہ میں شاہ صاحب کو مجددین کی فہرست سے خارج کر کے متجددین کی صف میں لے جا کر بٹھاتا۔

مابعد الطبیعی بنیاد کو استوار کرنے کے بعد وہ اس پر ایک نظام اخلاق مرتب کرتے ہیں اور اس مقام پر انتہائی جذبۂ اعتراف کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ وہ یونانی اتھکس کی غلامی سے پہلو بچا رہے ہیں، اُس اتھکس کی غلامی سے جس میں دوّانی جیسے لوگ جا پھنسے اور جس کا اچھا خاصا اثر امام غزالی تک کے ذہن پر قائم رہا۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس اتھکس کے اثر سے بالکل آزاد ہو چکے تھے۔

نظام اخلاق پر وہ ایک اجتماعی فلسفہ (Social Philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جس کے لئے انہوں نے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے، اور اس

لہ :— جو فلسفہ مسلمانوں میں رائج تھا وہ اسلام کے عملی، اخلاقی اور اعتقادی نظام سے کوئی ربط نہ رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا اسی قدر مسلمانوں کی زندگی بگڑتی چلی گئی، عقیدے بھی کمزور ہوئے، اخلاق بھی ڈھیلے ہوئے اور قوائے عمل بھی سرد ہو گئے۔ ذہن میں متصادم خیالات کی کشمکش کا یہ طبیعی نتیجہ ہے۔ اور یہی اثرات موجودہ مغربی فلسفہ کے رواج سے بھی رونما ہو رہا ہے، کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظام اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا۔

سلسلہ میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مدن، عدالت، ضربِ محاصل (Taxation) انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اُن اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انہوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا، اور قدرتی بات یہ ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

آخر میں انہوں نے تاریخ ملل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم از کم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں جس نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور اتنے مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجائے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام صحیح الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے، اور جو لوگ اُن میں سے زیادہ قوتِ عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لئے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔ مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا، اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات صاف صاف بیان کیں، بلکہ اس بحث کو بتکرار ایسے طریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحاب ایمان

کے لیئے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جد وجہد کیئے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہوگیا۔ یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مگر ازالہ تو گویا ہے ہی اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافت اسلامی اور بادشاہی دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف بادشاہی کو اور ان تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو بادشاہی کے ساتھ مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں ازروئے تاریخ پیدا ہوئے اور دوسری طرف خلافت اسلامی کی خصوصیات اور شرائط کو اور اُن رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں جو اسلامی خلافت میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے۔

سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحبؒ کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید[1] کی منصب امامت، عبقات تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئے گی۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ

---

[1] :۔ سید صاحب ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی شاہ اسماعیل صاحب ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی! انقلابی تحریک کی چنگاری سید صاحب کے دل میں غالباً ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ زمانے ہی میں بھڑک اٹھی۔

کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی، اور پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کئے ہوئے تھے، جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اس چیز نے اُس تحریک کے لئے گویا زمین تیار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے، بلکہ یوں کہیئے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجودِ متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) انہوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرامؓ کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔

(۲) انہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سر تنزل ملک میں مشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغازِ کار کے لئے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین خط ہو سکتا تھا پھر اس جہاد

میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانینِ جنگ استعمال کئے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انہوں نے صحیح معنوں میں روحِ اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا۔ ان کی جنگ ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لئے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی، ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشا کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لئے جب وہ لڑے تو حسبِ قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمامِ حجت کر کے تلوار اٹھائی! ور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ ان کی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ ان کی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈا بنتی تھی، اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ ان کی فوج کسی علاقے سے گزری ہو اور اس علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے خواہ اُس پر قائم رہنے میں ان کو فائدہ پہنچے یا نقصان۔ انہوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبر نہ پائے گئے۔

(۳) اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا

اُس میں انہوں نے ٹھیک اُس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل و انصاف وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انہوں نے اسی حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیقؓ و فاروقؓ نے کی تھی۔

یہ لوگ بعض طبعی اسباب کی وجہ سے، جن کا ذکر آگے آتا ہے، ناکام ہوئے مگر خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اس کے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔

اسباب ناکامی اس آخری مجددانہ تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنا عموماً اُن حضرات کے مذاق کے خلاف ہے جو بزرگوں کا ذکر عقیدت ہی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں اس عنوان کے تحت عرض کرونگا وہ میرے بہت سے بھائیوں کے لئے تکلیف کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد اس تمام ذکر اذکار سے محض سابقین بالایمان کو خراج تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ آئندہ تجدید دین کے لئے ان کے کاموں سے سبق حاصل کرنا بھی ہے، تو ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور ان بزرگوں کے کارناموں کا سراغ لگانے کے ساتھ اُن اسباب کا کھوج بھی لگائیں جن کی وجہ سے یہ اپنے مقصد کو پہنچنے میں ناکام ہوئے، شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادوں نے علماء حق اور صالحین کی جو عظیم القدر جماعت پیدا کی، اور پھر سید صاحب اور شاہ شہید

نے صلاح و اتقاء کا جو لشکر فراہم کیا، اُس کے حالات پڑھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرنِ اوّل کے صحابہ و تابعین کی سیرتیں پڑھ رہے ہیں" اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم سے اس قدر قریب زمانہ میں اس پایہ کے لوگ ہو گذرے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی و انقلابی تحریک، جس کے لیڈر اور کارکن ایسے صالح و متقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی ممکن سعی و عمل کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، اور اس کے برعکس کئی ہزار میل سے آئے ہوئے انگریز یہاں خالص جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس سوال کو عقیدت مندی کے جوش میں لاجواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ صلاح و تقویٰ اور جہاد کو اس دنیا کی اصلاح کے معاملہ میں ضعیف الاثر سمجھنے لگیں اور یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکیگا۔ میں اس قسم کے شبہات فی الواقع لوگوں کی زبان سے سُن چکا ہوں، بلکہ حال میں جب مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اسٹریچی ہال کے بھرے جلسہ میں میرے سامنے یہی شبہ پیش کیا گیا تھا اور اسے رفع کرنے کے لئے مجھے ایک مختصر تقریر کرنی پڑی تھی۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت علماء صالحین کی جو جماعت ہمارے درمیان موجود ہے وہ بالعموم اس مسئلہ میں بالکل خالی الذہن ہے، حالانکہ اگر اس کی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے سبق ہمیں مل سکتے ہیں جن سے استفادہ کر کے آئندہ زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح کام ہو سکتا ہے۔

پہلا سبب | پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور

ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اُس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو اِن حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، اور اس کی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے، لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال، اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اِس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اِس کے سوا اُس کے لئے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اُس کے لئے زبان بھی دوسری اختیار کی جا سکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جا سکتا ہے، اور پیری مریدی اور اِس سلسلہ کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اسی قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے، حالانکہ یہ پرانا قالب اِس بنا پر قابلِ ترک تھا اور ہے کہ مدتہائے دراز سے اسی قالب میں جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے اور اِس کی کثرتِ اشاعت نے مسلمانوں کو سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے۔ اور اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، مگر یہ قالب جہاں استعمال کیا گیا اور پھر وہی تمام بیماریاں عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جبکہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو، اُسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اِس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے۔

اور اس کے قریب جاتے ہی اِن مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہیں، جو صدیوں اِن کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی وہی "بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" والی ذہنیت جس کے بعد پیر صاحب اور اربابٌ من دون اللہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوتِ تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیٔ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اس کے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی اور معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو گئے۔ اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے۔ مسلمانوں کے اِس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالباً اِس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا! اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی تھی جو ابنِ تیمیہ کی تھی، لیکن شاہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی

سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا، اس لئے مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتیٰ کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ ان کے حلقہ میں ایسا پیدا ہو گیا جو شیعوں کی طرح ان کی غیبوبت کا قائل ہوا اور اب تک اُن کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے! اب جس کسی کو تجدید دین کے لئے کوئی کام کرنا ہو اُس کے لئے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات، رموز و اشارات، لباس، اطوار، پیری مریدی اور ہر اُس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب دوسری چیز جو مجھے تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ سید صاحب اور شاہ شہید نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اُس علاقہ کو اس انقلاب کے لئے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اُن کا لشکر تو یقیناً بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا۔ مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں ان کی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا، تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظامِ حکومت کو سمجھنے اور اُس کے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اس لئے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کریں گے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا اور جتنا ملک قابو میں آیا اُس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا

کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اوران سے وہ توقعات وابستہ کرنا جو اصلی مسلمان ہی پوری کر سکتے ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے — تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں وہ نقش برآب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا، اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تیسرا سبب اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تجدیدی تحریک کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لئے جو کام کیا، اُس کی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھئے اور دوسرے پلڑے میں اُس طاقت کو رکھیے جس کے ساتھ اُن کی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی، تب آپ کو پورا اندازہ ہوگا کہ اِس عالم اسباب میں جو قوانین کار فرما ہیں اُن کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا۔ میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ اِن دونوں قوتوں میں ایک تولے اور پچاس من کی نسبت تھی اس لئے نتیجہ جو

فی الواقع رونما ہوا اُس کے سوا اور کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسماعیل شہید پیدا ہوئے اسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہوکر نئی طاقت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، فشتے ہیگل، کونت، شلائرماخر، اور مِل جیسے فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبیعات میں گیلوینی، اور وولٹا، علم الکیمیا میں لاووزیر، پرسیٹلے، ڈیوی، ہالوی اور برزلیس، حیاتیات میں لینے، ہالر، بیشات، اور وولف، جیسے محققین اٹھے جن کی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ اسی دور میں کویسنے، ٹرگوٹ، آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیر، مونٹسکیو، ڈینس ڈائڈیرو، لامیٹری، کیبانیس، بفون، روبینہ، انگلستان میں ٹامس پین، ولیم گوڈون، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پرسیٹلے، اراسمس ڈارون، اور جرمنی میں گویتھے، ہرڈر، شیلر، ونکلمان، لسنگ، اور بیرن دی ہولباشس، جیسے لوگ پیدا ہوئے، جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کرکے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی، پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیبِ بیان کی ندرت، اور مشکل

اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیئے، نظام تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا، اور تمدن وسیاست کا پورا نظام بدل دیا۔ اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں انجنیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھیرنا مشکل ہوگیا۔ فوجوں کی ترتیب، عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی پیہم تغیرات ہوئے، اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں۔ رائفل ایجاد ہوئی، ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں، قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں، اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلہ میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کرکے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلہ میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کرلیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکے پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند خاص اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے مگر وہاں قوموں کی قومیں جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں تیز رفتار پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہو گئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہو گئے جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا، اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اُن کے مقابلہ میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الہ آباد تک انکا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انہوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں

کے نیچے جم چکے تھے مگر اُن کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے، اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھے تھے انہوں نے سارے انتظامات تو کئے مگر اتنا نہ کیا کہ اہلِ نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جا رہی ہے، اور نئے آلات نئے وسائل نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لئے اٹھے ہیں، اُس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریز کی ہے، اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالف طاقت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دور رس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے جس حریف سے نمٹنا ہوگا اُس کے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کریں اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کریں۔ بہرحال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اس عالمِ اسباب میں ایسی چُوک کے نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے۔

مغربی جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کو جو ناکامی ہوئی اُس سے پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کے لئے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر

اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے، یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجدّدین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے اور اس نے بے حساب نئے مسائلِ زندگی پیدا کر دیئے ہیں جن کا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدماء کے ذہن میں نہ گذرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہٗ کے علم اور اس کی بخشش سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہِ عمل تعمیر کرنے کے لیئے ایسی مستقل قوتِ اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو، اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات

از جناب عبداللطیف صاحب اعظمی بی،اے (جامعی)

اسلام اپنے پیروؤں کے لئے صرف دوسری دنیا ہی کی بھلائی نہیں چاہتا، بلکہ اس دنیا میں بھی انہیں پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے محض چند عبادتوں کے طریقے ہی نہیں بتلائے، بلکہ زندگی کا ایک تصور بھی پیش کیا۔ اس نے زندگی کے کسی خاص شعبہ ہی تک اپنی تعلیمات کو محدود نہیں رکھا، بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات میں ان کی رہنمائی کی۔ غرض یہ ایک ایسا مذہب ہے، جو ہماری تمام زندگی پر حاوی ہے، لیکن چونکہ وہ کسی مخصوص قوم و ملک اور کسی محدود زمانہ کے لئے نہیں، بلکہ تمام قوموں، تمام ملکوں اور ہمیشہ عیش کے لئے آیا ہے، اس لئے اس کی تعلیمات اور نظام میں بہت زیادہ لچک اور کافی وسعت رکھی گئی ہے۔ وہ بنیادی اصول میں تو یقیناً کسی حال میں بھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، لیکن فروعات اور تفصیلات میں اس نے اپنے پیروؤں کو بہت حد تک آزادی دی ہے۔

اگرچہ آج مسلمان اکثر و بیشتر زوال کے شکار ہیں، لیکن وہ ایک شاندار ماضی کے مالک ہیں، انھوں نے ایک عرصہ تک معمورۂ ارضی کے ایک بڑے حصہ پر نہایت کامیاب حکومت کی ہے اور دنیا کو تہذیب و تمدن کا سبق سکھایا ہے، ان کی تہذیب حالات اور ماحول کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ انھوں نے نئے نئے ماحول میں نہ تو اپنے کو اجنبی رکھنے کی کوشش کی اور نہ کسی دوسری قوم کی اچھائیوں اور محاسن کو لینے میں تنگ نظری

یا تامل سے کام لیا، اچھائیوں کے متعلق ان کا اصول تھا "الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا" کہ حکمت کو اک گمشدہ مال سمجھو

جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

لیکن اسی کے ساتھ وہ کسی ایسے تصور کو بھی قبول نہیں کر سکتے تھے، جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہو۔

جس طرح اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اسی طرح اسلامی تہذیب بھی عالمگیر ہے۔ بقول پروفیسر محمد مجیب صاحب "یہ کسی ایک قوم اور کسی ایک زمانے کی تہذیب نہیں، اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا۔ اتنا ہی دشوار ہے، جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے، اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں، تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں، زور باندھا ہے۔ وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے، اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا، تو کبھی سیاست کا، کبھی دوسروں کے اثر کو دھیمے جان کر مٹایا، کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، انا ولا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل مل گئی۔ فضا کی ایک کیفیت بنکر نظر سے اوجھل ہو گئی، دن کا اجالا اور رات کا سکون بنکر زندگی میں گم ہو گئی"[1] لیکن اس تنوع، اس بوقلمی، اس رنگا رنگی اور اس وسعت و عالمگیریت کے باوجود اسے ایک طرح اس قدر محدود اور ممتاز کیا جا سکتا ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں کی تہذیبوں سے الگ اور نمایاں کیا جا سکے۔ کلچر کے متعلق کسی نے کہا ہے:۔ "The true seat of culture is the mind of Man." یعنی تہذیب کا اصلی محل انسان کا ذہن ہی۔ مسٹر H. Saito نے نسبتۃً واضح تعریف کی ہے، وہ لکھتا ہے،

---

[1] :۔ رسالہ جامعہ جون ۱۹۴۰ء صفحہ ۴۳۸

"Culture relates to the inner life of man, his mental, and spiritual qualities, his attitude towards life and nature."

اس لئے اسلامی تہذیب پر مذہب اسلام کی بنیادی تعلیمات کا اثر غالب اور نمایاں ہے۔ ذرا واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی تہذیب توحید، خدا پرستی، اور انسانیت کے خلاف ہو، تو وہ اسلامی تہذیب نہیں کہی جا سکتی۔ یہی ایک کسوٹی ہے جس پر اسلامی تہذیب کو پرکھا جا سکتا ہے اور یہی ایک پیمانہ ہے۔ جس کے ذریعہ اس کی تجدید و تعیین کی جا سکتی ہے، چنانچہ مسلمان جہاں بھی گئے، اپنی ان خصوصیات اور روایات کو محفوظ اور باقی رکھنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دوسری قوموں کے اختلاط و امتزاج سے اسلامی تہذیب میں، بعض ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں، جو اسلامی روح کے سراسر خلاف ہیں، ممکن ہے، انھیں ہم صحیح نہ سمجھتے ہوں، مگر وہ ہماری تہذیب میں اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ہم انھیں کسی طرح علیحدہ بھی نہیں کر سکتے۔

قرن اوّل میں اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات

تاریخ اسلام کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ میں بھی، جسے خیر القرون کہا جاتا ہے اور اس سر زمین پر، جہاں سے اسلامی تہذیب و تمدن کی شعاعوں نے دنیا کو منوّر کیا۔ ہم نے دوسری قوموں کی تہذیب و تمدن کے اثرات قبول کئے، مسلمان جہاں بھی گئے، گو انہیں حکمراں اور فاتح کی حیثیت حاصل تھی، مگر وہ وہاں کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، کچھ انہیں دیا، کچھ خود لیا اور ایک مبصر کے الفاظ میں "اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح اچھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس

نہیں کی کہ ہم نے کتنا لیا اور کتنا دیا، ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہیں لگائی، بلکہ اس طرح ملے جس طرح شکر اور پانی"[1] اسلامی تہذیب پر خارجی اثرات کے پڑنے میں حسب ذیل اسباب کو خصوصیت کے ساتھ بڑا دخل رہا ہے۔

۱۔ اسلامی فتوحات اور مذہبی تبلیغ و اشاعت۔

۲۔ تراجم۔

۳۔ مفتوحین کا قبولِ اسلام۔

(۱) اگرچہ آنحضرت صلعم کی حیات ہی میں عرب کے قرب و جوار کی قوموں اور ملکوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت شروع ہو گئی تھی، مگر اس کا دائرہ اثر صرف ملحقات ہی تک محدود تھا، آپ کی وفات کے بعد پے بہ پے فتوحات ہوئیں اور مسلمانوں کے تعلقات دوسری قوموں سے بڑھنے شروع ہوئے، عراق فتح ہوا، تو اس میں اصلی باشندوں کے علاوہ بعض عرب قبائل مثلاً ربیعہ، مضر اور انصار تھے اور کچھ فارس کے لوگ آباد تھے، جن میں کچھ مزدکی تھے اور تھوڑے بہت زرتشی۔ فارس فتح ہوا، تو وہاں اہل فارس کے علاوہ تھوڑے یہود آباد تھے اور کچھ رومی، جو روم اور فارس کی جنگ میں قید ہو کر آئے تھے، شام پر قدیم زمانہ میں مختلف قوموں نے حکومت کی تھی، اس لئے وہ بھی بے شمار تہذیبوں کا گہوارہ تھا، وہاں فینقیوں، اموریوں اور کنعانیوں کی مختلف تہذیبیں پوری طرح نمایاں تھیں، فراعنہ مصر، یونان، روم اور عرب

---

[1] :۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا مضمون "ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن و تہذیب کیا ہے" جامعہ جون ۴۰؁ء صفحہ ۴۳۹

غسان کے آثار بھی ہویدا تھے، سب سے آخر میں رومیوں نے اس پر حکومت کی تھی، اس لئے نصرانی تہذیب و تمدن کے آثار نسبتہً زیادہ نمایاں تھے اسلام نے جب اسے فتح کیا، تو یہ تمام تہذیبیں اس کو وراثت میں ملیں۔

سوریہ کی فتح کے وقت اس میں ارمن، یہود اور قلیل تعداد میں رومی آباد تھے اور ان کے ساتھ عرب کے بعض مشہور قبیلے مثلاً غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ اور کچھ تغلب کے لوگ بھی تھے، ان عرب قبیلوں کی زبان عربی اور آرامی سے مرکب تھی اور یہ اپنے کو شامی سمجھتے تھے، حجاز سے ان کا تعلق محض تجارتی تھا، چنانچہ جب عربوں نے اس پر لشکر کشی کی تو انھوں نے جنگ میں رومیوں کا ساتھ دیا۔

عربوں نے مصر پر بھی قبضہ کیا، جو قدیم مصری، یونانی اور رومی حضارت کا حامل تھا، یہاں مصریوں، رومیوں اور یہودیوں سے مخلوط و مرکب بہت سی قومیں آباد تھیں، مغربی ممالک مثلاً برقہ، ٹونس، الجزائر، مراکش اور جبل طارق سب عربوں کے زیر حکومت آگئے، اس سے پہلے ان پر رومیوں کی حکومت تھی۔

ان فتوحات نے فاتح اور مفتوح کے درمیان ایک قوی تعلق پیدا کر دیا اور قدرتی طور پر عرب ان قوموں کے اختلاط سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

(۲) عربوں نے فتوحات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد علوم و فنون کی عظیم الشان خدمت انجام دیں۔ بغیر کسی تعصب کے تمام ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون کو عربی میں منتقل کیا اس کے لئے ادارے قائم کئے علماء کو تلاش کر کر کے جمع کیا اور اس کے لئے پوری فیاضی کے ساتھ روپے صرف کئے۔ دولت عباسیہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف بہت زیادہ توجہ مبذول کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی شاید ہی کوئی اچھی کتاب

کسی فن کی ہوگی، جو عربی میں منتقل نہ ہوئی ہو۔

یونان قدیم زمانہ سے نہایت مہذب اور متمدن ملک تھا اور علم و دانش اور عقل و فکر کے لحاظ سے، اسے تمام دوسرے ملکوں پر فوقیت حاصل تھی اور طب، فلسفہ، حکمت، ادب، تاریخ، ریاضیات، سیاسیات اور فنون لطیفہ کا وہ مسلم امام تھا، اس لئے اس نے خصوصیت کے ساتھ عربی دل و دماغ کو بہت زیادہ متاثر کیا یونانی ثقافت کے تین بڑے مرکز تھے، جنھوں نے عربی تہذیب و تمدن پر اثر ڈالنے میں سب سے زیادہ نمایاں حصّہ لیا۔

(۱) جندیسابور۔ یہ طب یونانی کا سب سے ممتاز مرکز تھا، اس نے بہت بڑے بڑے طبیب پیدا ہوئے، عرب جاہلی کا مشہور طبیب حارث ابن کلاہ ثقفی نے یہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی، عباسی دربار کے بیشترا طبا بھی اسی ادارے کے تعلیم یافتہ تھے۔

(۲) حرّان۔ یہ ریاضیات اور خصوصیت کے ساتھ علم ہیئت کا مرکز تھا۔

(۳) اسکندریہ۔ یہ ادب اور فلسفہ کا مرکز تھا، یونانی فلسفہ کی اشاعت میں اس کو سب سے زیادہ ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

یہ تمام علوم و فنون جب عربی میں منتقل ہوئے اور سادہ لوح عرب ان کے ذریعہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات، دوسرے ممالک کی رسم و رواج اور دوسری ملتوں کے عقائد اور فلسفۂ زندگی سے غیر شعوری طور پر بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کی زبان و قلم سے غیر ارادی طور پر غیر اسلامی خیالات و تصورات کی اشاعت ہونے لگی، دوسری تہذیبوں کے اثرات ہی کی بنا پر، ابتدائے اسلام میں مسلمانوں

میں بے شمار فرقے اور جماعتیں پیدا ہوئیں جس کی وجہ سے مسلمان بہت جلد زوال کے شکار ہو گئے اور ان کے تصورات کی وحدت فنا ہو گئی۔

(۳) مفتوحین کا قبول اسلام، اختلاط و امتزاج کا دوسرا اہم سبب ہے، اگر ایک طرف نہایت کثرت سے فتوحات ہوئیں، تو دوسری طرف بہت بڑی تعداد میں مفتوح قومیں اسلام میں داخل ہوئیں اور وہ عربوں میں اس طرح گھل مل گئیں، گویا انہیں میں سے تھیں۔ علاوہ ازیں فاتح اور مفتوح دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے اور اجتماعی و اقتصادی امور میں برابر کے شریک تھے۔ ولہوسن نے لکھا ہے کہ کوفہ میں نصف سے زائد موالی آباد تھے، صنعت و حرفت اور تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی، ان میں سے اکثر زبان اور جنس (قومیت) کے لحاظ سے ایرانی تھے۔ یہ شروع شروع میں غلام تھے، اسلام لانے کے بعد انھیں آزاد کر دیا گیا۔ صرف ولاء کا رشتہ باقی رہ گیا تھا، اس جماعت نے عربوں کے اخلاق اور ان کی تہذیب و تمدن پر جو کچھ اثر ڈالا، اس سے آج کون انکار کر سکتا ہے۔

اسی طرح دوسرے تمام مفتوحہ ممالک، فارس، شام، مصر، مغرب وغیرہ میں عربی اور اجنبی عناصر اچھی طرح ایک دوسرے میں گھل مل گئے، حتیٰ کہ خود جزیرہ عرب محض جزیرۂ عرب نہیں رہا بلکہ جزیرۂ مسلمین بن گیا۔ دار الخلافت مدینہ، فتوحات کے زمانہ (عہد فاروقیؓ) میں تمام مسلمانوں کا مرجع بنا ہوا تھا، قیدی وہیں لائے جاتے تھے، حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ مفتوح ممالک میں غنیمت اور قیدیوں کی تقسیم نہ ہو، بلکہ ان کی تقسیم دار الخلافت میں ہو گی، اس طرح مدینہ اور اس کے قرب و جوار عجمیوں سے بھر گئے، اس کے علاوہ مکہ و مدینہ حجاج و زائرین کا مرجع تھے اور ہیں، اس کی وجہ سے

یہاں کے عرب بے شمار عناصر سے متاثر ہوئے اور ان کی حالت دوسرے صوبوں سے مختلف نہ رہ سکی، فرق صرف اس قدر تھا کہ ان میں عربی عنصر غالب تھا اور مفتوحہ ممالک میں عجمی عنصر زیادہ تھا۔

مذکورہ اسباب و وجوہ، اختلاط و امتزاج میں خاص طور پر معین ہوئے، اس طرح آہستہ آہستہ ایرانی و رومی معاشرت نے عربی معاشرت کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا اور ایران و روم کے قوانین، قرآن و رسول صلعم کے احکامات کے ساتھ مخلوط ہو گئے؛ فارس کی حکمت اور روم کے فلسفہ نے حکمت عرب کے ساتھ رشتہ جوڑا، فارسی و رومی طرز حکومت نے عربی طرز حکومت سے متاثر ہو کر ایک نئی شکل اختیار کی، غرضیکہ زندگی کے تمام سیاسی و اجتماعی شعبے اس اختلاط سے متاثر ہوئے اور ہر وہ شخص جس نے اس اختلاط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اعتراف کرے گا کہ یہ باہمی کسر و انکسار اور فعل و انفعال ایک اصول کے ماتحت ہوا، مفتوح قوم جن امور میں فاتح قوم سے بڑھ چڑھ کر ہوتی، فاتح قوم پوری رواداری کے ساتھ انکو باقی رکھتی، مثلاً عربوں کی فتح کے بعد دفاتر کا نظم و نسق بالکل حسب سابق باقی رہا اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔

جو قومیں اسلام میں داخل ہوئیں، ان کے پاس حکمت، امثال اور شعر و ادب کے ذخیرے تھے اور ان میں سے بعض قوموں کے علوم و فنون اور ان کی تمام علمی و مذہبی تحقیقات ضخیم مجلدات میں مدون تھیں، ان کے اسلام لانے کے بعد یہ سب چیزیں اسلام میں منتقل ہوئیں اور فاتح عرب ان تمام چیزوں سے متاثر ہوئے اس عام تاثیر و تاثر کے علاوہ یہ امر بھی خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے

کہ مفتوح قومیں اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی، اپنے بہت سے قدیم خیالات و معتقدات سے دست بردار نہیں ہوئیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، یہ کیسے ممکن تھا جو ایرانی، شامی، رومی اور قبطی اسلام میں داخل ہوئے، یک بیک ان کے دماغوں کی سطح اس قدر بلند ہو جاتی کہ وہ اپنے قدیم مالوفات و معتقدات سے یکقلم دستکش ہو کر اسلامی عقائد و افکار کو ان کی بالکل اصلی حالت میں قبول کر لیتے۔ ان میں سے ہر ایک کا معبود الگ، ان کا خدائی تصور الگ، جنت و دوزخ، شیطان و ملائکہ اور آخرت و انبیاء کے متعلق ان کے نظریات و معتقدات بالکل مختلف اور پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ قدیم روایات کا ایک انبوہ، ایسی صورت میں اسلام کے پیش کردہ تصورات کو بغیر کسی آمیزش کے قبول کر لینا، ان عجمیوں کے لئے نہایت دشوار تھا، چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے نو مسلموں نے بعض باتوں کو اپنے قدیم تصورات کے مطابق سمجھ لیا تھا، علامہ ازدی متوفی ۲۱۰ھ (تقریباً) نے فتوح الشام میں لکھا ہے کہ "شام کے ایک مسلمان نے ایک شخص سے اس شرط پر بکریوں کے چرانے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی اسے ہبہ کر دے اور وہ رات وہیں گذارے۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو فریقین معاملہ کو بلا بھیجا، ان دونوں نے معذرت کی کہ ہم کو اس کی حرمت کا علم نہ تھا۔ ابن عبد ربہ متوفی ۳۲۸ھ نے لکھا ہے کہ دیہاتی موالی (نو مسلم) لاعلمی کی بنا پر مذہب میں بہت تشدد سے کام لیتے تھے[1]

---

[1] العقد الفرید جز ۲ صفحہ ۹۰ - ۹۱ -

اس کا اثر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں۔ متعدد مذاہب کی شکل میں ظاہر ہوا۔
غالباً اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے فتوحات کے وقت اس سے خطرہ محسوس کیا تھا۔ ابو حنیفہ الدینوری متوفی ۲۹۰ھ نے اپنی کتاب الاخبار الطوال میں لکھا ہے۔

"مسلمانوں کو جنگ جلولا میں اس قدر مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا، فارس کی بہت سی لڑکیاں بھی گرفتار ہوئی تھیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت فاروقؓ فرماتے تھے، خداوندا! جلولا کی ان کنیزوں کی اولاد سے پناہ دے"

ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان موالیوں اور ان کی نسل سے اس لئے پناہ مانگی ہو کہ ان کی قومی عصبیت، عربی عصبیت کے بالکل مخالف تھی وہ اپنے سابق مذہبی اثرات کو یکقلم محو نہیں کر سکتے تھے اور اس سے اسلام کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، جیسا کہ بعد میں واقعی ہوا۔

فاتح اور مفتوح میں یہ مخفی بیگانگی برابر قائم رہی، یہاں تک کہ مذہبی و اجتماعی معاملات میں عربوں اور موالیوں (نومسلموں) کے اختلافات ابھرنا شروع ہوئے فوج میں تجسم کے مسئلہ پر مباحثے ہوتے تھے، زبان کا مسئلہ الگ وجہ نزاع تھا، دونوں کے جذبات و میلانات دو بالکل الگ الگ سمتوں میں بہ رہے تھے۔ عربوں کی اجتماعی احوال و معاملات کی شاہراہ الگ اور رومیوں اور ایرانیوں کے اجتماعی معاملات و مسائل کی بنیاد بالکل علیحدہ، جسمانی بُعد حضرت صدیق، حضرت فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی فتوحات نے مٹا دیا، لیکن روحانی یا ذہنی بُعد کسی نہ کسی حد تک باقی تھا، اور باقی رہا۔

عربی، فارسی، قبطی، یونانی اور عبرانی زبانوں کی رنگا رنگیاں برابر قائم رہیں

اب امت اسلامیہ وہ عربی امت نہ تھی جس کی زبان ایک، جس کا دین ایک اور جس کا رجحان و میلان ایک ہو۔ عہد رسالت کی یہ خصوصیت بہت جلد مٹ گئی اور اس کی جگہ ایک وسیع اور پائدار کشمکش نے لے لی، جس میں کبھی ایرانی غالب رہے، کبھی عرب اور کبھی رومی،

عربوں کی سیاست و اجتماع اور فلسفہ اور دیگر علوم میں علانیہ شکست ہوئی مگر دو چیزوں میں وہ برابر غالب رہے ایک زبان، دوسرے مذہب۔ تمام مفتوحہ ممالک میں عربی بولی اور سمجھی جاتی تھی اور یہی حکومت اور علوم کی زبان قرار پائی اسی طرح ان کا مذہب (اسلام) بھی ان تمام ممالک کا مذہب قرار پایا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دونوں یعنی زبان و مذہب بالکل اپنی اصلی حالت میں باقی رہے اور ان پر دوسری تہذیبوں کے اثرات نہیں پڑے۔ زبان میں بہت سے عجمی الفاظ اور عجمی ترکیبیں داخل ہوگئیں اور لحن اس قدر عام ہوگیا کہ زبان کی حفاظت کے لئے قوانین وضع کرنے پڑے۔ البتہ مذہب نسبتہً کم متاثر ہوا تاہم مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے، بہت سے مذاہب وضع ہوگئے اور اس میں ایسی چیزیں داخل ہوگئیں، جو مختلف فرقوں کے درمیان ایک مستقل جنگ و نزاع کا باعث ہیں لیکن ضحی الاسلام کے مصنف کے الفاظ میں

"باوجود ان قسم قسم کے اختلافات کے یہاں ایک روح تھی، جو تمام عالم اسلامی پر حاوی تھی اور یہ روح مشرقیت کی روح تھی، جو افراد میں اتحاد پیدا کر رہی تھی، اگرچہ نسل، نوع اور جنس کے اعتبار سے انہیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اسی روح نے یونانی فلسفہ کو جب وہ اسکی قلمرو میں داخل ہوا، تو اسے اپنا مطیع و منقاد بنایا اور اسے اپنی روحانیت اور اپنے الہامات کا لباس پہنا دیا، اسی باعث تاریخ و علم الاجتماع کے علماء اہل مشرق کی خصوصیات میں اشتراک محسوس کرتے ہیں وہ خصوصیات جو اہل مغرب کی خصوصیات کے بالکل مخالف ہیں وہ روح جو اہل مشرق میں نسل در نسل وراثتہً چلی آرہی ہے اور جس کی تکوین میں ان کے

طبعی اور اجتماعی ماحول نے مدد کی ہے اور ان میں وہ ذوق اور وہ احساس پیدا کر دیا ہے، جو مغربی احساس کے خلاف ہے اور وہ تمدن پیدا کر دیا ہے، جو بہت سی باتوں میں مغربی تمدن کا مخالف ہے، بدھ مت، یہودیت، نصرانیت وغیرہ بہت سے مذاہبِ عالم وجود میں آئے، لیکن اس روح نے انہیں ایسے رنگ میں رنگ دیا جس میں مادّیت کا شائبہ تک نہیں۔ یہ روح دلوں میں ایک ایسے عالم کا یقین پیدا کرتی ہے، جو اس عالم کے ماوراء ہے، جو جنت کی خواہش رکھتی ہے اور دوزخ سے ڈرتی ہے اور دنیوی سعادت اور جسمانی خواہشات کے علاوہ ایک دوسری روحانی سعادت پر بھی یقین رکھتی ہے، جس وقت اسلام آیا اور اس نے مشرقی ممالک پر اقتدار حاصل کیا تو اس روح کو اور بھی تقویت پہونچی اور یہ اتحاد عمل کا ایک بڑا سبب بن گئی، چنانچہ ان تمام مختلف قوموں نے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، ایک ہی زبان بولنے لگیں اور اکثر نے ایک ہی مذہب اختیار کر لیا۔

علماء کی سیاحتیں، خیالات و افکار کی آمیزش و اتحاد میں بہت ممد و مفید ثابت ہوئیں، یہ سیاح دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مبادلۂ خیال کرتے، انہیں اپنے مذہب اور سیاست کی طرف دعوت دیتے، علاوہ ازیں مرکزِ خلافت سے جو احکامات بھیجے جاتے وہ اصولاً ایک ہی تعلیم کے حامل ہوتے تھے۔

ان سب چیزوں نے مختلف قوموں کے درمیان ایک ایسا اتحاد پیدا کر دیا کہ انہیں ایک قوم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان کا ادب ایک تھا، تہذیب ایک تھی اور علوم مشترک تھے[1]۔"

---

[1] ضحی الاسلام صفحہ ۱۷۔

اسلامی تہذیب پر ہندوستانی تہذیب کا اثر

ٹھیک جس طرح ایرانی، یونانی، رومانی، مصری، یہودی اور نصرانی وغیرہ تہذیبوں سے اسلامی تہذیب متاثر ہوئی، اسی طرح ہندوستانی تہذیب کا بھی اس نے اثر قبول کیا۔ مہنجوڈرو اور ہڑپا کے اکتشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پانچ ہزار قبل مسیح بھی نہایت اعلیٰ اور نفیس تہذیب و تمدن کا مالک تھا، پھر کیونکر ممکن تھا کہ مسلمان اس قدیم ترین تہذیب سے استفادہ نہ کرتے۔ اگر ہندوستانی تہذیب کے اثرات پر تاریخی نظر ڈالی جائے، تو اس کے تین اسباب ملیں گے۔

۱۔ ہندوستان سے عربوں کے قدیم تجارتی تعلقات۔

۲۔ دوسری صدی ہجری میں ہندوستانی علوم و فنون کا عربی میں ترجمہ ہونا۔

۳۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں حکومت کا قایم ہونا اور ہندوؤں سے براہ راست مختلف قسم کے گہرے تعلقات کا پیدا ہونا۔

(۱) ہندوستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانہ سے پائے جاتے ہیں، عرب زمانۂ جاہلیت سے ہندوستان آئے تھے اور یہاں کی مشہور پیداوار اور عمدہ مصنوعات لے جاتے تھے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ غیر شعوری طور پر یہاں کی تہذیب و تمدن بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنی قوم میں پھیلاتے۔ عربی زبان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ مثلاً چندل (صندل) موشکا (میسک) کپور (کافور) جائے پھل (جافل) تری پھل (اطریفل) چھینٹ (شیت) وغیرہ جو عربی میں ذرا سی تبدیلی سے نظر آتے ہیں، یہ درحقیقت اسی دور کی یادگار ہیں، اسی طرح طلوع اسلام سے قبل ہی عرب ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے۔

(۲) دوسرا دروازہ جس کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن عرب مسلمانوں تک پہونچی، دوسری صدی ہجری کے تراجم ہیں یہ سبھی جانتے ہیں کہ عباسی عہد علوم و فنون کی ترقی و عروج کا زمانہ تھا منصور (۷۵۴-۷۷۵) اور ہارون (۷۸۶-۸۰۹) کے زمانے میں خصوصیت کے ساتھ مختلف زبانوں سے نہایت کثرت سے ترجمے کئے گئے، اسی زمانہ میں فارسی اور پہلوی کے علاوہ سنسکرت سے براہ راست ہندوستانی علوم و فنون عربی میں منتقل کئے گئے، کتاب البدبیلا ہورو بد آسف سند ہند شناق، بیدپا، کلیلہ و دمنہ، اور کتاب سند باد وغیرہ اسی زمانہ میں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ یہ ترجمے عربی لٹریچر میں اس طرح گھل مل گئے کہ جید علماء کی تحریریں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ عربوں کے اثر و انفعال اور ان کی مرعوبیت کا اندازہ ایک حد تک ان کی اُن تحریروں سے کیا جا سکتا ہے، جو انھوں نے ہندوستان کی تعریف و توصیف اور اس کے علوم و فنون کی فوقیت اور افضلیت پر لکھی ہیں جاحظ جیسا مشہور انشا پرداز، فلاسفر اور متکلم لکھتا ہے :۔

" لیکن ہندوستان کے باشندے، تو ہم نے ان کو پایا ہے کہ وہ جوتش (نجوم) اور حساب میں بڑھے ہوئے ہیں اور ان کا ایک خاص ہندی خط ہے اور طب میں بھی وہ آگے ہیں اور طب کے بعض عجیب بھید ان کو معلوم ہیں اور سخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور سے ان کے پاس ہیں، پھر مجسموں اور اسٹیچر بنانا، رنگوں سے تصویر پیدا کرنا اور تعمیر وغیرہ میں ان کو کمال ہے، پھر شطرنج کے وہ موجد ہیں، جو ذہانت اور سمجھ کا بہترین کھیل ہے، تلواریں عمدہ بناتے ہیں اور ان کے چلانے کا سب کرتب جانتے ہیں، زہر اتارنے اور درد دور کرنے کے منتر جانتے ہیں، ان کی موسیقی بھی دلپسند ہے ان کے

ایک ساز کا نام کنکنہ (؟) ہے، جو کدو پر ایک تار کو تان کر بجاتے ہیں، جو ستار کے تاروں اور جھانجھ کا کام دیتا ہے، ان کے ہاں ہر قسم کا ناچ بھی ہے........ ان کے یہاں مختلف قسم کے خط ہیں شاعری کا ذخیرہ بھی ہے اور تقریروں کا حصہ بھی ہے، طب، فلسفہ اور ادب و اخلاق کے علوم بھی ان کے پاس ہیں انھیں کے یہاں سے کلیلہ و دمنہ کتاب ہمارے پاس آئی۔ ان میں رائے اور بہادری ہے، اور جو بعض خوبیاں ان میں ہیں چینیوں میں بھی نہیں۔ ان میں صفائی اور پاکیزگی کے بھی اوصاف ہیں، خوبصورتی، نمکینی اور خوش قامتی اور خوش روئی بھی ہے، اور انہیں کے ملک سے بادشاہوں کے پاس وہ عود آتی ہے، جس کی نظیر نہیں اور فکر کا علم انہیں کے پاس سے آیا ہے اور ان کو ایسے منتر معلوم ہیں، جن کو یہ زہر پر پڑھ دیں تو زہر بیکار ہو جائے، پھر نجوم کے حساب کے وہی موجد ہیں، ان کی عورتوں کو گانا اور مردوں کو پکانا خوب آتا ہے، صراف اور روپے کا کاروبار کرنے والے اپنے کیسے اور خزانے ان کے سوا اور کسی کے حوالہ نہیں کرتے، جتنے (عراق میں) صراف ہیں، سب کے ہاں خزانچی خاص سندھی ہوگا یا کسی سندھی کا لڑکا ہوگا، کیونکہ ان کو حساب و کتاب اور صرافی کے کاموں سے فطری مناسبت ہے، پھر یہ ایماندار اور وفادار ملازم بھی ہوتے ہیں ''۔[1]

ابو ضلع سندھی نامی ایک شاعر نے ہندوستان اور اس کی پیداوار کی ایک طویل نظم میں بڑی تعریف کی ہے، آخیر میں وہ لکھتا ہے، ۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸ بحوالہ رسالہ فخر السودان علی البضیان، حافظ مجموعہ رسائل جاحظ، صفحہ ۸۱ مطبوعہ ۱۳۲۴ھ (مصر)۔

فہل ینکر خدا لفضل الا الرجل الاخطل

یعنی تو کیا، بیوقوف کے سوائے کوئی اور بھی ہندوستان کی ان خوبیوں کا انکار کر سکتا ہے۔

(۳) لیکن جب مسلمان ہندوستان آئے اور یہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تو اگرچہ فاتح اور حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے، مگر یہاں کی تہذیب و تمدن سے ان کی تہذیب اس قدر متاثر ہوئی کہ اسے ایک نئی تہذیب کہا جائے، تو بیجا نہ ہوگا۔ بلا شبہ مسلمانوں نے یہاں کی معاشرت، رسم ورواج، فلسفۂ زندگی اور عقائد و خیالات میں انقلاب پیدا کیا، مگر خود مسلمانوں کی جو تہذیب بنی، اسمیں یہاں کے خمیر اور یہاں کی خصوصیات کو نمایاں جگہ حاصل ہوئی۔

مسلمان بادشاہوں نے کچھ رواداری کی خاطر اور کچھ اپنے مصالح کی بنا پر ہندوؤں کو حکومت کے انتظام وانصرام میں مساوی شریک و سہیم بنایا، ہندو شہزادے جو حکومت کے حامی ہوتے، مسلمان بادشاہوں کی ہرطرح مدد کرتے اور ان کی حفاظت و خدمت کے لئے ہندوؤں کی فوجیں پیش کرتے، جو مسلم فوجوں کے دوش بدوش پورے اشتراک کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتیں۔ علاوہ ازیں دونوں قوموں کے افراد بلا تکلف اور بہ رضا و رغبت ایک دوسرے کی خدمت اور مدد کرتے، چنانچہ الفنسٹن (Elphinstone) کی روایت کے مطابق، جب مالوہ کے مسلمان حکمراں نے بہمنی سلطنت پر حملہ کیا، تو اس کی بارہ ہزار کی فوج میں افغان اور راجپوت دونوں شریک تھے اور جب بیجانگر کے راجہ دیوراج نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کی، تو ان کے سرداروں کو زمینیں عطا کیں اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے دارالسلطنت میں ایک مسجد تعمیر کروائی اسیطرح

مسلمان بھی ہندوؤں کی امداد و اعانت میں پیش پیش ہوتے۔ دونوں قوموں میں نہایت گہرے تعلقات تھے، گو مذہب کے لحاظ سے دو تھے، لیکن معاملات اور تعلقات میں ایک تھے۔

حکومت کے چھوٹے چھوٹے عہدوں پر تو شروع ہی سے ہندو مقرر تھے، مگر اکبر کے عہد میں نہایت اہم اور بڑی بڑی جگہیں بھی ہندوؤں کو دی گئیں۔ چنانچہ راجہ ٹوڈرمل حکومت کے نہایت اہم عہدہ داروں میں سے تھا، یہ پنجاب کے کالستھ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس نے محاصل کے کام میں اس قدر مہارت کا ثبوت دیا کہ اکبر نے اسے وزیر مالیات مقرر کیا، شہنشاہ کے فوجی کمانڈروں میں بھی اسے بڑی حیثیت حاصل تھی، اسی طرح بیربل بھی اگرچہ ہندو تھا، مگر شہنشاہ کے مشیروں میں سے تھا، ان دونوں ہندوؤں کا حکومت کے امور اور عہدہ داروں کے تقرر میں بڑا دخل تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں اس کثرت سے ہندوؤں کو عہدے دئے گئے کہ اورنگ زیب کے لئے یہ ایک مستقل اور مشکل ترین مسئلہ بن گیا۔ ظاہر ہے یہ اتحاد و اتفاق اور یہ رفاقت و معیت ایک دوسرے پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ اثر سماجی اور معاشرتی اختلاط و امتزاج کا پڑا، جسے کسی مصنوعی عمل* کے ذریعہ کچھ زیادہ عرصہ تک روکا نہیں جا سکتا تھا۔ خصوصاً آپس کی شادیوں کے ذریعہ جو اثرات مرتب ہوئے، وہ بہت زیادہ ہمہ گیر تھے، مسلمان مذہبی پابندیوں کی وجہ سے کسی غیر مسلمان خاندان میں اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کر سکتے، لیکن غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ بعض شرائط کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے۔ اس لئے شروع شروع میں مسلمانوں نے ہندو خاندانوں میں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے سے احتراز کیا، مگر ہندوؤں کی لڑکیوں سے نہایت کثرت سے شادیاں کیں! سکا

*(Artificial Process)

نتیجہ وہی نکلا، جو پہلی صدی ہجری میں اور اس کے بعد غلاموں اور لونڈیوں کے اختلاط سے پیدا ہوا تھا، یعنی غیر شعوری طور پر مسلمان خاندانوں میں ہندوؤں کی رسمیں حتیٰ کہ ان کے عقائد داخل ہو گئے، اور وہ اس طرح ان کی زندگی میں گھل مل گئے کہ اب انہیں علیٰحدہ کرنا ناممکن ہے لیکن اس اجتماعی اختلاط و امتزاج کا اثر محض ان کی خارجی زندگی پر پڑا، ان کے داخلی زندگی یا ان کے دل و دماغ جنہیں (True Seat of Culture) کہا گیا ہو، جس چیز سے متاثر ہوئے، وہ ہندوؤں کا فلسفہ اور ان کے عقائد ہیں۔

یونان کی طرح ہندوستان کا بھی ایک مخصوص فلسفہ ہے، مؤرخین فلسفہ نے اس پر نہایت تفصیل سے بحثیں کی ہیں کہ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ یونان نے بہت کچھ ہندوستان کے فلسفہ سے لیا ہے اور ہندوستان نے بہت کچھ یونان سے۔ اس کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہندوستانی فلسفہ میں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو اسے یونانی فلسفہ سے ممتاز اور جدا کرتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے فلسفہ میں مذہب کا اثر بہت نمایاں ہے اور اس کا طرز استدلال عالمانہ نہیں، شاعرانہ ہے، تعبیر کی اساس حقائق پر نہیں بلکہ مجاز استعارہ اور تخیل پر ہے، اسی طرح ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد اس جذبہ پر ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اس دنیا کے آلام و مصائب سے مکتی (نجات) حاصل کرے اور یونانیوں کے فلسفہ کا اوّلین سبب تجسس Curiosity ہے، یعنی مظاہر عالم کو دیکھ کر، اس کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے کا انسان میں شوق پیدا ہوا، اس لئے اس نے فلسفہ سیکھا۔

شاید میرا مفہوم واضح نہ ہو سکا، اس لئے رسالہ معارف کے ایک مضمون سے ذیل میں اقتباس نقل کرتا ہوں، جس میں ہندی فلسفہ کی خصوصیات واضح کرنے کی

کوشش کی گئی ہے:۔

"ہندوستان کے فلسفہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں۔ مغرب میں فلسفہ کا مفہوم محض نظری* (*Theoretical) ہے۔ انسان کی فطرت چونکہ ہر وقت نظام قدرت کی پیچیدگیوں کے متعلق سوال کرتی ہے اس لئے فلسفہ ان سوالوں کے جواب دینے کا نام ہے۔ یونان میں فلسفہ کا آغاز محض متفسرانہ فطرت انسانی کا ظہور تھا، تھلیس، پارمینیڈز، اور زینو (Zeno)، وغیرہ فلاسفۂ یونان کی تمام تر کوشش (Parmenides. Thales) صرف اسی نظام کائنات کے مسائل سلجھانے میں صرف ہوئیں، اگرچہ بعض جگہ مثلاً سقراط اور افلاطون کے فلسفہ میں عملی رنگ کافی طور پر نمایاں ہے، لیکن ان کے بعد ارسطو نے دوبارہ فلسفہ کو محض نظری کر دیا اور اس کے بعد آج تک کسی مغربی فلسفہ کو مغربی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا...... لیکن ہندوستان کے فلسفہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سرتاپا عملی ہے، فلسفہ کی جو کتاب بھی ہندوستان میں لکھی گئی۔ اس کا پہلا سوال دنیا کے مصائب اور تکالیف کے متعلق ہے، کوئی انسان خواہ امیر ہو یا غریب، عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بوڑھا اس عالمگیر رنج و غم سے فارغ نہیں، اگرچہ تمام فلسفہ ہند میں یہ بات مشترک ہے، لیکن مہاتما بدھ کی تعلیم بہت زیادہ اسی مضمون کو دہراتی ہے، بدھ فلسفہ کے تین عنوان ہیں۔

(۱) دنیا رنج و غم سے پُر ہے۔

(۲) اسکا چھٹکارا حاصل کرنا ممکن ہے۔

(۳) وہ کیا طریق ہے؟ "[۱]

---

[۱] معارف نمبر ۶ جلد ۱۳ صفحہ ۴۳۱۔

ہندوؤں کے جن عقائد و خیالات کا مسلمانوں کے افکار و آراء پر اثر پڑا، ان میں سے تناسخ قابل ذکر ہے، یہ عقیدہ مسلمانوں کے متعدد مذہبی فرقوں کے خیالات و افکار میں نظر آتا ہے، مثلاً احمد بن حائط (یہ پہلے معتزلی تھے مگر بعد میں تائب ہو گئے) ابو مسلم خراسانی، فراسطا اور محمد بن زکریا الرازی نے لکھا ہے کہ روح ایک جسم سے جدا ہونے کے بعد کسی اور جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ احمد بن حائط نے اپنے دعویٰ پر ذیل کی دو آیتیں بطور دلیل کے پیش کی ہیں۔[1]

یٰاَیُّھَا الاِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ (الانفطار)	اے انسان تجھکو کس چیز نے، تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھکو بنایا، پھر تیرے اعضاء کو درست کیا، پھر تجھکو (مناسب) اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں چاہا، تجھکو ترکیب دیدیا۔

دوسری آیت ہے۔

جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۝ (سورۃ الشوریٰ)	اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) چارپایوں کے جوڑے بنائے اور اسکے ذریعہ سے تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے۔

بعض اہل تشیع بھی تناسخ سے ملتے جلتے خیالات رکھتے ہیں، مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ

---

[1] الملل والنحل لابن حزم جلد ۱ صفحہ ۹۰، ۹۱۔

حضرت علیؓ میں اللہ نے اپنی روح کا ایک جزو منتقل کر دیا ہے، جو ان کے بعد ائمہ میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔ نصیریہ کا اعتقاد ہے کہ گناہ گار، یہودی، انصاری یا سنی مسلمان کی شکل میں دنیا میں واپس کر دئے جاتے ہیں، اور جو حضرت علیؓ پر ایمان نہیں لاتے انہیں اونٹ، خچر، گدھے، کتے یا کسی اور جانور کی شکل دیدی جاتی ہے، صوفیوں اور ولیوں کے افکار بھی اس عقیدہ سے تھوڑے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

تصوف اسلام پر دوسری تہذیبوں کے اثرات

تصوف کے متعلق بعض لوگوں کا، خصوصاً مستشرقین یورپ کا خیال ہے کہ یہ بالکل غیر اسلامی چیز ہے، لیکن جمہور مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ "مسلمانوں میں ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود ہے، جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے، اپنا نصب العین محض یاد خدا و ذکر الٰہی کو رکھا ہے اور سلوک مقیدیہ کے مختلف طریقوں پر عامل رہا"[۱] یہ گروہ بعد میں صوفیا کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض یورپین مبصرین نے بھی اس کی تردید کی ہے کہ تصوف، اسلامی تخیل نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۲۳ء میں کیمبرج کی "مسلم ایسوسی ایشن" میں تصوف پر ایک فلسفیانہ خطبہ پڑھا تھا، تو موصوف نے اس میں یہ تسلیم کیا تھا کہ

> یہ سمجھا گیا ہے کہ تصوف کے اہم تخیلات غیر اسلامی سرچشموں مثلاً عیسائی رہبانیت، یونانی مذہب و حکمت یا ہندوستانی معتقدات وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ اس میں کچھ حقیقت ہے، لیکن یہ کسی طرح حقیقت تامہ نہیں۔ میری رائے میں تصوف نے اگرا ثنائے ارتقا میں متفرق تحریکات سے بھی جس سے

---

[۱] تصوف اسلام صفحہ ۱

اس کو سابقہ پڑا، بہت کچھ حاصل کیا، لیکن اصلی اور بنیادی طور پر وہ اسلام ہی سے تعلق رکھتا ہے"۔[1]

چونکہ اس پر دوسری تہذیبوں کے اثرات بہت زیادہ پڑے ہیں، اس لئے اسپر مستقل عنوان کے ماتحت ذرا تفصیل سے بحث کی ضرورت ہے۔

تصوف مسلمانوں میں قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے، کوفہ اور بصرہ، صوفیوں کے اہم ترین مرکز تھے، کوفہ کے ابو ہاشم متوفی ۱۵۰ھ پہلے شخص ہیں جنھیں صوفی کہا گیا۔

شروع شروع میں تصوف کی غرض و غایت یہ تھی کہ "نفس کو مجاہدہ وریاضت کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے ہٹاکر، اخلاق حسنہ پر لگانا، اور زہد، حلم، صبر، اخلاص، صدق وغیرہ صفات حمیدہ سے آراستہ کرنا، تاکہ دنیا میں بھی عزت و مسرت حاصل ہو اور آخرت میں بھی ثواب و رضائے الٰہی حاصل ہو۔ جنید بغدادی سے پوچھا گیا، "تصوف کیا ہے؟ جواب دیا "برے اخلاق چھوڑ دینا اور اچھے اخلاق اختیار کر لینا"۔[2] حضرت ذوالنون مصری کہتے ہیں۔

الصوفی اذا نطق بان نطقہ	صوفی وہ ہے کہ جب گفتار میں آتا ہے، تو اس کی زبان
عن الحقائق و ان سکت نطقت	اس کے حقیقت حال کی ترجمان ہوتی ہے اور جب
عنہ الجوارح بقطع العلائق	خاموش ہوتا ہے تو اس کے اعضاء شہادت دیتے ہیں کہ
	وہ علائق کو قطع کر چکا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو خطبہ کا ترجمہ، جامعہ جولائی ۲۶ء صفحہ ۲۶۴

[2] گمراہ صوفی صفحہ ۱۴۔

حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہے کہ۔

التصوف ترك على حظ النفس	تصوف تمام حظوظ نفسانی کے ترک کا نام ہے۔

امام ابوالقاسم قشیری لکھتے ہیں۔

وبناء هذا الامر وملائکه على حفظ آداب الشريعة وصون اليه عن المدالی الحرام والشبه وحفظ الحواس عن الخطورات وعو الانفاس مع الله تعالے عن الغفلات۔	تصوف کی ساری بنیاد اسپر ہی کہ آداب شریعت کی پابندی رہے، حرام و مشتبہ چیزوں سے دستکش کی جائے، ناجائز اوہام و خیالات سے حواس کو آلودہ نہ ہونے دیا جائے اور غفلتوں سے بچکر خدائے تعالیٰ کی یاد میں وقت گذاری کی جائے۔

مگر بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔

حضرت شیخ جیلانی، بلکہ ان کے مرید با اختصاص اور بانی، سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر اور یہی رنگ غالب ہے، اس زمانہ کے بعد شیخ ابن عربی کے اثر سے" ان تخیلات کو اور تقویت ہوتی گئی۔ چنانچہ ملا جامیؒ کی لوائح ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہو چکا تھا اور رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جنپر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔

تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات،

ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے، جس کے صرف بعض اجزاء اسلامی کہے جا سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی تلاش و دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا یہ اسلامی تصوف نہیں، اسلامی تصوف وہ تھا، جو خود حضرت سرور کائنات صلعم کا تھا، جو ابو بکر صدیقؓ و علی مرتضیٰؓ کا تھا، جو سلمانؓ و ابوذرؓ کا تھا، جس کی تعلیم جنید بغدادیؒ و رابعہ بصریؒ نے دی ہے، جس کی ہدایت شیخ جیلانیؒ و شیخ سہروردیؒ۔ مرشد اجمیریؒ و محبوب دہلویؒ۔ خواجہ نقشبندیؒ، مجدد سرہندیؒ کرتے اور جس کی دعوت اس دور آخر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زبان قلم دیتی رہی ''۔ [۵]

یوں تو تصوف اسلام پر بے شمار تہذیبوں کے اثرات پڑے ہیں، لیکن عیسائیت بودھ مت اور نو فلاطونیت کے اثرات نہایت ممتاز اور نمایاں ہیں۔ عیسائیت کا اثر جرچ نے زیادہ رہبانوں خصوصاً Syrian Euchites کے ذریعہ ہوا ہے جن کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد عبادت و ریاضت تھا۔ توکل نے صوفیوں کے یہاں جو شکل اختیار کر لی ہے، وہ تمام تر عیسائیت کے اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے۔ حلاج کا عقیدہ تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی ہی صورت کے مطابق پیدا کیا ہے، اس نے خدا کی روح اور انسان کے اتحاد کا تذکرہ کرتے وقت لاہوت اور ناسوت کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں! اس کا یہ عقیدہ شامی عیسائیوں کے عقائد و خیالات سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے متاثر ہو کر بعض صوفی بھی تقریباً اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں

---

[۵] تصوف اسلام صفحہ ۲،۳۔

مثلاً ابن عربی کہتے ہیں کہ خدا کے اصلی نام تین ہیں اللہ، رحمٰن، رب اور دوسرے تمام اسماء ان کے ماتحت ہیں۔ اور جیلی کا خیال ہے کہ "خدا کی ذات تثلیث یعنی اصل الاصول خالق اور مخلوق میں منقسم ہے"، تمام جمہور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلعم ہیں جیسے ایک انسان تھے، فرق صرف اس قدر تھا کہ ان پر وحی اترتی تھی، ورنہ بشریت میں مساوی تھے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

کہہ کہ میرا پروردگار پاک ہے، میں نہیں ہوں مگر آدمی پیغام پہونچانے والا۔

سورہ کہف میں ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۝

کہہ دیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس بس یہ وحی آتی کہ تمہارا معبود، ایک ہی معبود ہے۔

مگر بعض صوفیوں نے انہیں ربانی صفات سے متصف کیا ہے اور جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تقدیس کی ہے، اسی طرح انھوں نے بھی آنحضرت صلعم کی۔ عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ "جس نے مجھے دیکھا (آسمانی) باپ کو دیکھا" اسی قسم کا تخیل بعض صوفیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا، خدا کو دیکھا" صوفیوں کے "انسان کامل" کا تخیل، عیسائیوں کے لوگس (Logos) کے تخیل سے بہت زیادہ مشابہہ اور قریب ہے، شیعوں میں بھی اس قسم کے بعض عقائد پائے جاتے ہیں اور اس کی بعض علامتیں سنیوں میں بھی نظر آتی ہیں۔

بلخ، ماوراء النہر اور ترکستان میں اسلام کے پہونچنے سے قبل بدھ مت کو پورا عروج حاصل تھا، اس لئے جب مسلمان پہونچے تو بدھ فلاسفی اور بیراگیوں کی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ایک قصہ مشہور ہے کہ بلخ کا شہزادہ ابراہیم بن ادھم بدھ کے حالات سے اس قدر متاثر ہوا کہ خلعت شاہی کو اتار پھینکا اور جنگلوں کی راہ لی اور خانہ بدوش صوفیوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔ تسبیح اور مقامات وغیرہ بدھ مت کے اثر و غلبہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں، نظریۂ فنا کے متعلق بھی مستشرقین یورپ کا خیال ہے کہ یہ نروان کی ایک شکل ہے مگر مسلمانوں نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر احمد غلوش اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ صوفیوں نے جس حالت کو فنا سے تعبیر کیا ہے، بعینہ وہی چیز ہے، جس کو بدھ مت میں نروان سے تعبیر کیا گیا ہے بدھ متیوں کے نزدیک نروان کے حصول کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو طرح طرح کی اذیتوں میں ڈالتا ہے، یہاں تک کہ نفس اس سے بالکل الگ ہو جاتا ہے، اور پھر اس کے پاس لوٹ کر نہیں آتا کیونکہ انکے خیال کے مطابق یہ شخص اب خود بدھ یعنی ایک دوسرا معبود بن جاتا ہے۔ تعالی اللہ عما یقولون علواً کبیرا۔

ان بت پرستانہ مزعومات کے اندر جو گمراہیاں اور ضلالتیں چھپی ہوئی ہیں، اس وقت میں ان کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ یہ واضح

کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے صوفیوں کا فنا اس سے بالکل علیٰحدہ چیز ہے۔ صوفی اپنے نفس اور تمام حیوانی صفات سے خدا کی محبت میں علیٰحدہ ہوتا ہے اور علیٰحدگی کے لئے جو شے بطور وسیلہ اختیار کرتا ہے، وہ اپنے نفس کی تہذیب و تربیت ہے، نہ کہ تعذیب و تشکیل اور جب وہ اس مقام کی تمام بلندیوں کو پوری طرح حاصل کر لیتا ہے، تو وہ ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہے، جہاں ذات الٰہی کے سوا اور کوئی چیز اس کو نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ خود اس کا نفس بھی اس سے اوجھل ہو جاتا ہے، جو اس کے پہلو میں تھا، جب واجب الوجود کا جلوہ نظر آتا ہے، باقی اس کے علاوہ جتنے بھی وجود ہیں، سب مجازی اور غیر ذاتی ہیں، کیونکہ سب پر عدم و فنا طاری ہوتا ہے، حقیقی اور ذاتی وجود صرف اس ذات برتر کے لئے ہے، جو ابدی اور دائمی ہے[1]"

خارجی اثرات میں، تیسرا سب سے بڑا اثر، نو فلاطونی فلاسفی کا ہے۔ سنہ ۸۰۰ء اور سنہ ۸۶۰ء کے درمیان، یونانی علوم و فنون کا سیلاب، شام کی عیسائی خانقاہوں جندیشاپور (خوزستان) کی فارسی اکیڈیمی اور ہران (عراق) کے صابیوں کے ذریعہ اسلام سے ٹکرایا اور جب پانی اترا تو اپنے بہت سے اثرات چھوڑتا گیا۔

ارسطو کی نام نہاد کتاب "ارسطو کی دینیات[*]" جس کا سنہ ۸۴۰ء میں عربی میں ترجمہ ہوا تھا، متصوفانہ نظریوں سے بھری ہوئی ہے، اس سے مغربی ایشیا کے تمام ممالک واقف تھے، اس لئے ظاہر ہے، اس سے بھی اسلامی تصوف یقیناً متاثر ہوا

---

[1] الاصلاح، اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۶۳۱، ۶۳۲۔

[*] (Theology of Aristotle)

ہوگا۔ یہ محض تحیت اتفاق نہیں تھا کہ مصری صوفی ذوالنون متوفی ۲۵۹ھ نے نظریۂ نوافلاطونیت کی سب سے پہلے تشریح و توضیح کی، بلکہ یہ اس وقت کے فلسفہ کا اثر تھا، جس سے اس زمانہ کے تمام صوفیوں کے دل و دماغ متاثر نظر آتے ہیں۔

تصوف میں ایک نہایت اہم مسئلہ وحدۃ الوجود کا ہے، اس کے متعلق یہ عام شہرت ہے کہ یہ تخیل ہندوؤں کے عقیدۂ ویدانت کا نتیجہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وحدۃ الوجود اور ویدانت میں بہت زیادہ مشابہت اور یگانگت ہے، مگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکا کہ اسلامی تصوف میں، یہ تخیل ویدانت کے اثر و غلبہ سے پیدا ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمان صوفیوں میں یہ تخیل نوافلاطونیت کے اثر سے پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ہم سے تحقیق ہو سکی ہے، ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہندو ویدانت کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا ہے، حالانکہ اسلام میں اس تخیل کا آغاز تیسری صدی کے آخر سے یعنی حسین بن منصور حلاج کے زمانہ سے ہے اور اس کا کمال پانچویں صدی ہجری میں محی الدین بن عربی کے زمانہ میں نظر آتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو ویدانتوں کے تخیل سے مسلمان صوفیوں پر اثر پڑا[1] مگر اسلامی تصوف میں اس تخیل کا اثر اس سے پہلے

---

[1] چنانچہ غالباً آٹھویں صدی ہجری میں بنگال کے ایک نومسلم پنڈت اور ایک صوفی عالم نے طلسم سنسکرت کی کتاب امرت کنڈ کا عربی میں ترجمہ "عین الحیواۃ" کے نام سے کیا، پھر اب فارسی سے اردو میں اس کا ترجمہ ہوا ہے اور دارا نے اپنے زمانہ میں سرِ اکبر کے نام سے جوگ لبشٹ کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ (عرب و ہند کے تعلقات)۔

معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں محی الدین ابن عربی سب سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس عقیدہ کی سب سے پُرجوش حمایت کی ہے اور وہ اسپین کے باشندے تھے اور کبھی ہندو فلاسفی سے ان کو دو چار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہندو ویدانت سے نہیں، بلکہ نوافلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوئے تھے، لیکن جہاں تک حسین بن منصور حلاج کا تعلق ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس وحدۃ الوجود کا مدعی تھا، وہ معتبر اور محتاط مسلمان صوفیوں کا وحدۃ الوجود نہیں، بلکہ وہ حلول یعنی ایک قسم سے ہندوؤں کے اوتار کے مسئلہ کا قائل تھا، اس کی تفصیل اس کے پرانے تذکرہ نویسوں نے پوری طرح کی ہے اور خود اس کی تصنیف کتاب الطواسین سے بھی ثابت ہے، اس کے بعد یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ہندوستان کے جادو، منترا ور کرتب کو سیکھنے یا جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آیا تھا، اس لئے عجب نہیں کہ وہ یہیں سے اپنا مسئلہ وحدۃ الوجود عراق لے گیا ہو[۱]۔"

خاتمۂ کلام اس بسط و تفصیل سے اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات، دکھانے کا مقصد محض یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلامی تہذیب ہر طرح کی یکطرفی اور جمود سے بری، نامی اور زمانہ و ماحول کی ضروریات کے مطابق بدلتے رہنے والی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں ہے، یہ کیونکر ممکن ہے، ہر قوم کے، داخلی

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۴۸ ۔

زندگی اور مابعدالطبیعیاتی مسائل کے متعلق مخصوص عقائد ہوتے ہیں، جن کا تحفظ اور بقا اس قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہے، بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔

"آج جرمنی اور اطالیہ کے فلسفیوں نے، جو تمدنی مسائل پر گہری نظر سے غور کرتے ہیں، اس حقیقت کو روشن کر دیا ہے اور سب اہل فکر اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ایک تہذیب نہیں بلکہ بہت سی تہذیبیں ہیں، جو ایک ہی "عین" کے ماتحت ہونے کے باوجود مختلف قوموں کے فطری اور ذہنی ماحول کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، وہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتی ہیں، لیکن ایک کا دوسرے میں ضم ہو جانا، اس کی حامل جماعت کی ذہنی موت کی دلیل ہے۔" [1]

یوں تو، جب کہ شروع میں، ہم نے عرض کیا ہے، تہذیب اپنے اندر بہت ہی وسیع مفہوم رکھتی ہے، لیکن بحث کی سہولت کے لئے، اگر اس کا تجزیہ کیا جائے، تو حسب ذیل تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) روح کی حقیقت کو سمجھنا اور کائنات کو معلوم کرنا۔

(۲) اخلاق یعنی اپنی فطرت پر قابو پانا اور مقاصد جات کے پیش نظر نفس کی تہذیب کرنا۔

(۳) حیات اجتماعی یعنی فرد کا جماعت میں زندگی بسر کرنا۔

(۴) علم کی مدد سے قدرت پر قابو حاصل کرنا یعنی زندگی کے بقا اور آرام و آسائش

---

[1] مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ صفحہ ۱۱۔

کے لئے کوشش کرنا۔

(۵) سماج کی بھلائی اور اس کی بہبود و فلاح۔

(۶) آرٹ یعنی فنون لطیفہ۔

شروع کی دو چیزیں یعنی روح کی حقیقت کو سمجھنا اور اخلاق کلیتہً مذہب سے متعلق ہیں، مسلمانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان پر کسی اور قوم کی تہذیب و تمدن کا اثر نہ پڑنے پائے۔ اگر اتفاق سے اس پر کسی اور مذہب و ملّت کا کچھ بھی اثر پڑا ہے، تو وہ جمہور مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ تیسری چیز یعنی جات اجتماعی کلی طور پر تو مذہب سے متعلق نہیں ہے، مگر مذہبی تعلیمات سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتی، اجتماعی زندگی کے متعلق اسلام کی نہایت مفید تعلیمات ہیں، ان پر مسلمانوں نے عمل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ حالات اور ماحول کے مقتضیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا لیکن آخر کی تین شقیں کلیتہً زمان و مکان سے متعلق ہیں، ان کے متعلق، مسلمانوں کا رویہ ہمیشہ آزاد رہا ہے اور ان مسائل کے حل کے وقت انھوں نے ہمیشہ زمانہ اور ملک کے مخصوص حالات و مسائل کو پیش نظر رکھا ہے۔

مآخذ

اس مضمون کی تیاری میں، معارف، جامعہ، الاصلاح (اعظم گڈھ) ترجمان القرآن، المقتطف (مصر) Modern Review، (کلکتہ) وغیرہ کے ان مضامین کے علاوہ جو زیر بحث مضمون پر لکھے گئے ہیں حسب ذیل کتابوں سے خاص طور پر مدد لی گئی ہے

اردو:-

(۱) تصوف اسلام، مولفہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی۔
۲۔ عرب و ہند کے تعلقات، مولفہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔
۳۔ گمراہ صوفی، مصنفہ حافظ ابو الفرج عبدالرحمٰن بن جوزیؒ، مترجمہ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی۔

عربی:-
۴۔ ضحی الاسلام۔ تالیف علامہ احمد امین (مصر)
۵۔ مختارات جرجی زیدان (مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کے مضامین کا مجموعہ)

انگریزی:-

6. S. Khuda Bukhsh: Contributions to the History of Islamic Civilization.
7. Tara Chand: Influence of Islam on Indian Culture

کیاموجودہ تصوف خالص اسلامی ہے

جذبات انسانی میں عشق و محبت کا جذبہ جس قدر شدید اور قوی ہے شاید ہی کوئی دوسرا ہو اس جذبے کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ انسان دنیا و مافیہا حتیٰ کہ کبھی اپنے آپکو بھی بھول جاتا ہے اور ایک ہی کی یاد کا ہو رہتا ہے۔ العشق نار تحرق ماسوی المحبوب[1]، یہ تو خاک کے پتلے اور گوشت پوست کے پیکر سے محبت کا حال ہے، جس کا حسن عارضی اور جس کا جمال ناقص ٹھہرا۔ اگر تقدیر سے شاہد ازلی و جمیل حقیقی کی محبت میسر ہو جائے تو اُسکی گیرائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہرِ او اولیٰ بود
جرعہ خاک آلود چوں مجنوں کند   صاف اگر باشد ندانم چوں کند (رومی)

یہی محبت ہے جو اکثر صوفیہ کی رائے میں تصوف کی اساس کار اور ملاک الامر ہے

عشقِ آن زندہ گزیں کو باقیست   از شراب جانفزایت ساقیست (رومی)

ذوق حقیقی یا تصوف کی یہی شراب جانفزا ہے جس کی طرف عمر بن فارض مصری نے عجب مستانہ انداز میں اشارہ کیا ہے۔

صفاءٌ ولا ماءٌ ولطفٌ ولا ہوا   ونورٌ ولا نارٌ وروحٌ ولا جسمٌ

آج کی صحبت میں ہمیں یہ جستجو کرنی ہے کہ یہ شراب خاص میکدۂ اسلام کی کشید کی

---

[1] عشق ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا سب کو جلا دیتی ہے۔

ہوئی ہے یا کسی باہر کے شرانجانہ سے لائی گئی ہے۔

تصوف[5] کی اصطلاح کی طرح تصوف کے عقیدے کا ماخذ بھی عرصے سے مابہ البحث رہا ہے اور مختلف مفکرین نے مختلف[6] نظرئے پیش کئے ہیں۔ للناس فی ما یعشقون مذاہب۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوّل مشہور نظرئے بیان کر دئے جائیں۔ پھر اُن کی تفصیل اور اُن پر محاکمہ کیا جائے۔

(۱) تصوف ایک خودرَو پودے کی طرح ہے جو مناسب زمین پاکر اُگتا اور پھولتا پھلتا ہے۔ اسلام میں بھی کسی خارجی یا داخلی اثر کے بغیر یہ تحریک از خود پیدا ہوئی اور موافق حالات میں ترقی پکڑ گئی۔

(۲) تصوف سامی مذہب کے خلاف آریائی دماغ کا رَدِّعمل ہے۔

(۳) صوفیانہ عقائد مسیحی افکار کے رہین منت ہیں۔

(۴) یہ اعتقاد فلسفہ یونان کی صدائے بازگشت ہے۔

(۵) تصوف عین تعلیمات اسلام کا خلاصہ اور ارشادات کتاب وسنت کا عطر ہے۔

ان میں آخری رائے کے علاوہ جو خود حضرات صوفیہ کی تصانیف میں ملتی ہے اور اہل البیت اعلم بمافی البیت کے مطابق مستند سمجھی جاسکتی ہے، سب اغیار کی رائیں ہیں، آئیے اب اس اجمال کی تفصیل بھی سنئے۔

(۱) پہلے گروہ کا خیال ہے کہ ہر قوم وملت کی ذہنی زندگی میں ایک دور ایسا ضرور

---

[5] لفظ تصوف کا استعمال قرآن۔ حدیث۔ بلکہ کلام جاہلیت میں بھی کہیں نہیں ملتا۔ علمانے اس کے مختلف ماخذ بتائے ہیں، مگر اصح یہ ہے کہ یہ صوف سے مشتق ہے، جاحظ بصری، پہلا عربی مصنف ہے جس نے اس لفظ کو برتا۔ اور ابوہاشم (معاصر سفیان ثوری) پہلے شخص ہیں جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ [6] تاریخ ادب ایران از براؤن۔

آتا ہے جب کہ اُس میں صوفیانہ خیالات وافکار کی جانب میلان پیدا ہو جاتا ہے، چینی، مصری۔ ہندی۔ عبرانی، ایرانی۔ رومی۔ یونانی۔ غرض ہر قوم تمدن کے عہد طفولیت سے نکل کر دماغی ارتقاء کے اس دور سے ضرور گذری ہے، چنانچہ اُن کے ادب میں اس عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ خواہ تصوف کی تعریف یوں کرو کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ روح کے بے واسطہ رابطہ کا نام ہے،[1] خواہ یوں کہو کہ[2] وہ صوفی کے ظاہر و باطن کے سقوط اور ہر چیز میں ذات حق کے شہود سے عبارت ہے۔ بہرصورت آدمی کے دماغ میں اس لگن کا پیدا ہونا فطری اور ہر ملّت کا اس منزل سے گذرنا یقینی ہے۔

(۲) دوسری جماعت کا گمان ہے کہ تصوف آریائی مذاہب سے ماخوذ ہے۔ اُس کے زعم میں آریائی مذاہب گویا نہایت ترقی یافتہ تھے اور اسلام معاذ اللہ سمیات کا ایسا ضابطہ تھا جو شائستہ دماغوں سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے جب آریہ اقوام کو اسلام قبول کرنا پڑا تو قدرۃً قدیم مذاہب اور اسلام میں کشمکش کے بعد ایک طرح کی مفاہمت عمل میں آئی اسی مفاہمت کا نام تصوف ہے۔ اس موقع پر آریائی مذاہب کے عناصر ترکیبی پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے جس سے آگے چل کر تصوف کے حدود متعین ہوسکیں۔ آریائی مذاہب کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ایرانی اور ہندی

الف۔ ایرانی ظہور اسلام سے پہلے ایران میں ساسانی حکومت اور زرتشتی مذہب کا دور دورہ تھا۔ زرتشتی عام طور پر کائنات میں دو حکمران قوتوں (قوت خیر و قوت شر) کے وجود کے

---

(1) **The doctrine of the soul's union with Absolute Reality. (Ency. of Ethics).**

[2] التصوف اسقاط الرویۃ للحق ظاہراً و باطناً (میر فی نیشاپوری)

اعتقاد رکھتے اور ثنوی المذہب کہلاتے ہیں۔ مگر محققین حال کا بیان ہے کہ زرتشت کی تعلیمات توحید پر مبنی تھیں۔

زرتشت[1] نے آریائی دیوتاؤں پر جو اسورا (یا اہورا) کہلاتے ہیں مزدا کا اضافہ کر کے مزدا اہورا یا اہورا مزدا (اور مزد یا ہرمز) کا لفظ خدائے برحق کے لئے استعمال کیا۔ وہ اسی کو خالق کائنات اور رب العالمین مانتا ہے اور اسی کو جامع صفات کاملہ اور لایق پرستش جانتا ہے۔ آریائی دیو (دیوتا) کو زرتشتی آئین میں شیطان یا خداوند اہل دروغ (آکویا دروگ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور اگنی وغیرہ کو فرشتہ قرار دیا گیا ہے، گاتھا میں اہرمن اور یزداں کی باہمی آویزش کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ درست ہے کہ گاتھا میں انگرہ مینو (اہرمن یا خرد خبیث) کی مذمت جابجا ملتی ہے۔ لیکن وہ اہورا مزدا کا مقابل نہیں بلکہ سپنتا مینو (سپنتمن یا خرد مقدس) کا مقابل ہے، زرتشت کے نزدیک انسان کا فرض ہے کہ دنیا کو حقیر نہ جانے زندگی بھر دروغ سے جنگ کرتا رہے اور ہومت، ہوخت۔ ہوورشت (پندار نیک۔ گفتار نیک۔ کردار نیک) کو اپنا دستور العمل بنائے۔ وہ قربانی۔ فدیہ مسکرات کا مخالف ہے۔ اور قیامت۔ صراط۔ میزان۔ حساب۔ بہشت۔ دوزخ برزخ سب کا معتقد ہے۔

ان بیانات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ایرانی مذہب ہندی تناسخ کے مقابلہ میں توحید سے قریب تر اور شرک سے دور تر ہے۔ تاہم نام نہاد تصوف کا ایرانی مذہب میں سراغ نہیں ملتا۔ یہ صحیح ہے کہ زرتشتی مذہب میں علمائے مغرب نے ایک خاص قدیم فرقے کا پتہ لگایا ہے

---

[1] گاتھا ترجمہ پور داؤد

جو (Zervanites) کے نام سے موسوم اور ایک محیط کُل علت اوّلی کا قائل تھا۔ مگر خود ایران میں اُس کو کبھی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

ب۔ ہندی[۱]۔ اس شاخ میں صوفیانہ خیالات وعقائد کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مورخین نے ہندو تصوف[۲] کے چار دور قائم کئے ہیں۔ اوّل۔ ویدوں کا زمانہ۔ اس دور میں اگرچہ دیوتاوں کا دور دورہ ہے، بایں ہمہ کبھی کبھی اس ظلمت میں عرفان کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ دوم۔ اُپنشد کا زمانہ۔ اس دور میں ویدانت کا شباب اور وحدت الوجود کا عروج منتہائے کمال کو پہونچ جاتا ہے۔ سوم مہا بھارت کا زمانہ۔ جب کہ گیتا کی تعلیم اور کرشن جی کے نغمے[۳] نے اس شراب کو اور دوآتشہ کردیا اور یہ خیالات گھر گھر عام ہو گئے چہارم بھگتی کا عقیدہ۔ جس میں فلسفہ سے زیادہ محبت کا عنصر کارفرما تھا ہر صوفیانہ نظام کی طرح ہندو ویدانت جس کا سرچشمہ اپنشد ہے کائنات کی کثرت میں وحدت کی جویا ہے اور اُس کا مقصد یہ ہے کہ روح کا رابطہ ذات حق سے مستحکم کیا جائے یا دوسرے الفاظ میں سالک اپنے کو وحدت مطلق میں فنا کردے۔ ویدانت کے دو بڑے اسکول گذرے ہیں۔ ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق[۴] نے کائنات میں حلول کیا ہے۔ اور کائنات سے باہر اُس کا وجود نہیں۔ اور چونکہ وہ حقیقی اور غیر محدود ہے اس لئے کائنات بھی حقیقی اور غیر محدود

۱؎ Ency. of Ethics

۲؎ دراصل Mysticism کیلئے باطنیت اور اسلامی Mysticism کیلئے تصوف کی اصطلاح ہونی چاہئے۔

۳؎ جو بنیادِ دین سست گردو بے۔ تمائیم خود را بہ شکل کسے (گیتا فارسی ترجمہ فیضی)

۴؎ یہی وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں توحید و شرک کی حدود مل جاتی ہیں اور یہیں سے خدا کے تین ظہور (برہما۔ وشنو۔ شیو) کا اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔

ہے۔ دوسرے کا اعتقاد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا تمام اشیاء باطل اور اعتباری ہیں۔ صرف وہی حقیقت ہے اور باقی سب مجاز کائنات صرف اُس کا پرتو یا مظہر ہے۔ ہم اس کو کائنات کی مدد سے ادراک نہیں کر سکتے۔ البتہ جسمانی تعلقات کا بندھن توڑنے سے اُس کو پا سکتے ہیں۔ اس کے بغیر تناسخ کے چکر سے نکلنا اور معرفت حاصل کرنا محال ہے۔ معرفت کی معراج یہ ہے کہ آتما (روح) پرماتما (خدا) میں اپنے کو فنا کر دے۔ وحدت وجود کا یہ آخری نقطہ نظر (idealistic Pantheism) یا مثالی وجودیت کے نام سے موسوم ہے۔

ویدانت کے یہ دونوں دبستاں منتہی کے لئے ہیں۔ مبتدی کے لئے مذہبی رسوم وعبادات کی پابندی بھی لازم ہے۔ منتہی کے نزدیک خالق عالم (برہما) صفات سے پاک (نرگن) اور غیر موجود فی الخارج[1] ہے۔ مبتدی کے عقیدے میں صفات سے متصف اور خارج میں موجود ہے۔

ویدانت کا پہلا معلم یادرائن کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد شنکر آچاریہ (آٹھویں صدی مسیحی) نے جو شارح اپنشد کہلاتا ہے اس عقیدہ کی تبلیغ کی، پھر گیارہویں صدی مسیحی میں رامانج نے اس کو رواج دینے اور مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔ شنکر نے عرفان کو وصال آلہی کا ذریعہ ٹہرایا تھا۔ رامانج نے عشق کو نجات ابدی کا وسیلہ قرار دیا۔ غرض کہ ہندو مذہب میں تصوف (ویدانت) اور تصوف میں وحدت الوجود کا اعتقاد اس قدر راسخ ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے۔ دراصل ہندو مذہب ایسا ساز ہے کہ اسکے جس تار کو چھوؤ گے یہی نغمہ سنائی دے گا۔ ایکو برہم دو تیونا ستے (لاموجود الا اللہ)

---

[1] ویدانت اور افلاطونیت جدید میں خدا کو Impersonal غیر موجود فی الخارج مانا گیا ہے اور مسیحیت اور اسلام میں Personal موجود فی الخارج۔

حقیقت سب کچھ ہے (اس لئے کہ وہی سب پر محیط ہے) اور کچھ بھی نہیں (اس لئے کہ فہم و نطق سے بالاتر ہے)" "اگر اُس کو تلاش کرنا ہے تو اپنے نفس میں تلاش کرو وہ ہستیٔ مطلق ایک طرف رائی کے دانہ سے بھی چھوٹی اور دوسری طرف تمام جہانوں سے بھی بڑی ہے "

اس جگہ ہندوستان کے دوسرے مذاہب بُدھ مت اور جین مت کی تفصیل میں جانا بے سود ہے کیونکہ ان میں تصوف کا سرے سے وجود ہی نہیں، بلکہ اوّل الذکر میں وجود باری کا عقیدہ بھی مفقود ہے۔ بدھ مت کرم اور آواگون کی معتقد ہے اور نجات کا مفہوم بس اسی قدر مانتی ہے کہ روح کرم کے نتائج سے چھٹکارا پائے اور آواگون کے چکر سے نکل جائے۔ اور اُس کی صورت یہ ہے کہ خودی[۱] کو مٹا کر عدم محض میں پہونچ جائے اسی کا نام اس کی اصطلاح میں نِروان ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ صرف فنا کی قائل ہے؛ بقا بعد فنا اس کی نزدیک بے معنی ہے۔ رہی جین مت۔ اس میں بھی کرم اور آواگون اساسی عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُس کے لحاظ سے نجات اس میں منحصر ہے کہ انسان عمل کی دنیا سے اپنا تعلق بالکل قطع کرلے۔

اس اعتبار سے ان مذاہب کی حیثیت محض سلبی ہے۔ ویدانت کی حیثیت ایجابی۔

(۳) تیسرے[۲] فرقہ کی رائے میں تصوف مسیحی عقائد سے ماخوذ ہے۔ یعنی جس طرح مسیحی حق سبحانہ کی دو حیثیتیں مانتے ہیں ایک لاہوتی۔ دوسرے ناسوتی۔ اسی طرح مسلمان صوفیہ

---

[۱] بدھ کے نزدیک خودی جو پیری۔ مرض اور موت کے مصائب کی جڑ ہے صرف اس طرح مٹ سکتی ہے کہ سہ گانہ عادات ردیہ شہوت۔ حسد۔ فریب سے اجتناب کرکے ہشت گانہ اخلاق رفیہ کو اختیار کیا جائے! ور احساس۔ فکر اور ارادہ کو برائی سے ملوث نہ ہونے دیا جائے[۲] (Ency. of Ethics)

بھی قائل ہیں۔ الحق المنزہ ہوالحق المشبہ (ابن عربی) حقیقت یہ ہے کہ انجیل میں تصوف کی نسبت چند اشارات کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ لے دے کر ایک رہبانیت رہ جاتی ہے جو عیسائیوں اور بعض صوفیہ میں مشترک پائی جاتی ہے مگر وہ بھی ابتدعوہا کے داغ سے داغدار اور ما رعوہا حق رعایتہا کی فرد جرم کی سزاوار ٹھہرتی ہے۔

اکثر علمائے یوروپ کا خیال ہے کہ مسیحی تصوف خود مذہب یہود سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ امر بظاہر موجب حیرت ہے کہ یہودیت جیسا خشک اور ضابطہ پرست مذہب بھی تصوف کی چاشنی سے خالی نہیں پھر اس کی بھی دو شاخیں ہوگئی ہیں۔ ایک تالمودی تصوف جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا کائنات کا مسکن ہے۔ کائنات خدا کا مسکن نہیں یعنی عالم خالق عالم سے الگ کوئی چیز نہیں اُسی کی ذات سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ دوسری یہودی یونانی تصوف جس کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ اسکندریہ میں یہودی مذہب کے ساتھ فلاطون اور ارسطو کی تصانیف بھی داخل نصاب تھیں۔

اگرچہ یہودی ربیوں کے دعوے کے مطابق خود توریت میں تصوف کا مواد موجود ہے جس کی شہادت میں وہ حضرات انبیاؑ کے مکاشفات والہامات۔ یشعیاہ نبیؑ کا مشاہدہ۔ حزقیل نبیؑ کا وجد۔ قرب اور کلام وغیرہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں ان کا تصوف یونانی فلاسفہ کے خیالات کا اثر ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۴) چوتھے دبستاں کی نظر میں اسلامی تصوف افلاطونیت جدید یا اشراق کا مرہون احسان ہے۔ افلاطونیت جدید یا اشراق کیا ہے۔ اس کے جواب کے لئے ہمارے ساتھ قبل مسیح کے یونان کی سیر کیجئے اور فلاسفہ قدیم کے بیانات سنئے۔ افلاطون[۱] (۴۲۹

---

[۱] (Lecture on Plotinus ، Ency. Brit)

۲۷۰ ق م) پہلا شخص تھا جس نے دریافت کیا کہ نفس انسانی (یا روح) کو بطور خود کلیات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے۔ چونکہ تجربات و مشاہدات کی دنیا میں ہمیں صرف جزئیات سے سروکار ہوتا ہے، اس لئے اس عالم کی کثرت میں وحدت کا۔ ادراک معلوم! اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ نفس کو اپنی کسی سابق زندگی میں کلیات (حق و حسن و خیر مطلق) کا تجربہ ہو چکا ہے جس سے اس موجودہ زندگی میں اُس کو مدد ملتی ہے۔ اس طور پر علم کی دو قسمیں ہوئیں۔ کلی اور جزئی۔ جو علی الترتیب عالم مثال[۵] اور عالم ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ عالم ظاہر کے تجربات ہمیں عالم مثال کی یاد دلاتے ہیں۔ اب یہی حق مطلق ہے جو اس دنیا میں بھی مختلف مظاہر کے اندر جلوہ گر ہے۔ اور نفس کی معراج یہ ہے کہ اُس کے اخلاق سے متخلق ہو کر اُس سے واصل ہو جائے۔

فلاطون کی اس بنیاد پر جس نے اچھی خاصی عمارت کھڑی کر دی وہ دراصل فلاطینوس (۲۰۴ - ۲۷۰ ع) تھا۔ یہ امونیوس کا شاگرد اور مصر کا باشندہ تھا۔ اسی نے اس دبستان کو جو افلاطونیت جدید کے نام سے مشہور رہے علمی حلقوں میں مقبول بنایا۔ اور درحقیقت یونانی تصوف بڑی حد تک فلاطینوس ہی کے نتائج فکر سے عبارت ہے۔ اس کے خیالات ہم تک اُس کے شاگرد دیارفری (فرفوریوس) کے ذریعے سے پہونچے ہیں۔ فلاطینوس کے خیالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ دنیائے محسوسات میں روح ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہ دراصل روح اعظم کا پرتو ہے، روح اعظم کو منظور ہوا کہ اپنی صورت

---

[۵] عالم امر اور عالم خلق کی اصطلاحیں صوفیہ کے یہاں اسی مفہوم کو واضح کرتی ہیں۔ الا لہ الخلق والامر

ایں جہاں نیست چوں ہستاں شدہ ؛ واں جہاں ہست بس پنہاں شدہ (رومی)

کا مشاہدہ کرے اور کائنات ظہور میں آگئی۔ جو اس کے اندر مخفی تھی۔ روح ناقابل تقسیم ہے۔ ہر کثرت وحدت کا آئینہ ہے۔ روح نہ پیدا ہوتی ہے نہ فنا ہوتی ہے۔ البتہ جو روح دنیا میں گناہ سے آلودہ ہو جاتی ہے اس کو تناسخ کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ روح کو آخری اور ابدی اقدار (یعنی حق۔ خیر اور حسن) کا تحقق صرف روحانی زندگی میں ممکن ہے۔ اور اسی کا نام جنت ہے۔

اس طور سے یہ نظام تین شعبوں پر مشتمل ہے۔ اوّل روح اعظم۔ دوم عالم مثال اور روح۔ سوم۔ عالم ناسوت۔ روح اعظم واحد۔ غیر متناہی۔ سرچشمہ حیات۔ علت مطلقہ اور وجود حقیقی ہے۔ پہلے روح اعظم سے عقل کا ظہور ہوا جو اُس کی مظہر کامل ہے۔ عقل سے روح وجود میں آئی جو عقل ہی کی طرح غیر مادّی ہے۔ روح کو عقل سے وہی نسبت ہے جو عقل کو واحد حقیقی سے۔ روح عقل اور عالم ناسوت کے مابین ایک واسطہ کا حکم رکھتی ہے، جو روح دنیا کے علائق سے آلودہ ہو جاتی ہے اُس کا فرض ہے کہ اخلاق فاضلہ کی مدد سے پھر اپنے کو روحانی زندگی کے قابل بنائے۔

(۵) پانچویں فریق یعنی خود صوفیہ[۵] کا دعویٰ ہے کہ تصوف تمام تر عین اسلام بلکہ روح اسلام ہے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن۔ حدیث اور خیر القرون کا تعامل پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد آیات ملتی ہیں، جن میں تزکیہ روح اور تصفیہ باطن کی تاکید اور ان فضائل سے اتصاف رکھنے والوں کی مدح وارد ہے۔ مثلاً ذروا ظاہر الاثم و باطنہ، ظاہر و باطن ہر قسم کے گناہ کو چھوڑ دو۔ لن ینال اللہ لحومہا ولا دماءہا

---

[۵] کتاب اللمع۔ کشف المحجوب۔ عوارف المعارف۔ تصوف اسلام وغیرہ۔

ولکن ینالہ التقویٰ منکم قربانی کا گوشت اور خون خدا کے حضور میں نہیں پہونچتا۔ البتہ تمہارا تقویٰ اور پرہیزگاری پہونچتی ہے۔ قد افلح من زکٰھا و قد خاب من دسّٰھا جس نے اپنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہونچا اور جس نے اس کو دبا دیا (اصلاح نہ کی) وہ خسارے میں رہا۔ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً و اذا خاطبھم الجاھون قالوا سلٰما خاصان خدا کی یہ شان ہے کہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب نادان لوگ اُن سے مخاطب ہوتے ہیں تو سلام کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔

الذین اٰمنو و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب جو ایمان لائے ہیں اور جن کے دلوں کو ذکر خدا سے سکون ملتا ہے۔ اور یاد رکھو ذکر خدا ہی سے سکون نصیب ہوتا ہے۔ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔ جو خدا پر بھروسا کرے گا۔ خدا اُس کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح صحاح میں احادیث رقاق اور فقرائے مہاجرین کی توصیف میں بکثرت روایات موجود ہیں۔ جن کا استقصا کیا جائے تو ایک مجلد تیار ہو جائے! اسی سے متعلق بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ سے وہ مشہور حدیث مروی ہے جو حدیث جبریل کہلاتی ہے۔ یعنی حضرت جبرئیل آدمی کے بھیس میں جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور منجملہ دوسرے سوالات کے یہ بھی دریافت کرتے ہیں ۔ ما الاحسان؟ احسان سے کیا مراد ہے ۔ارشاد ہوتا ہے ۔ اَن تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی احسان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہی ہے ۔ یہی احسان یا اخلاص ہے جو آگے چل کر تصوف کے نام سے مشہور ہوا۔ ان تعلیمات کا صحیح عملی نمونہ دیکھنا ہو تو حضرت رسول مقبولؐ اور آپ کے مخصوص اصحاب اور اہل بیت کی مبارک سیرتوں پر نظر

ڈالو۔ابو بکر صدیق۔علی مرتضٰی۔ابوذر۔سلمان۔حذیفہ ابو درداء۔ابوہریرہ۔عمار۔ابن ام مکتوم۔ابن مسعود صحابہ میں اور امام زین العابدین۔امام باقر۔عروہ بن زبیر۔اویس قرنی سعید بن جبیر۔سعید بن مُسیّب تابعین میں فقر و قناعت تسلیم و رضا کی اقلیم کے سلطان اور دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے گریزاں تھے۔تاریخ اسلام کے اوراق ان خاصان خدا کی زندگی کے سبق آموز واقعات سے معمور اور اپنے بیگانے سب اُن کے کمالات اور فضائل کے معترف نظر آتے ہیں۔

تصوف کے ماخذ کے بارے میں یہ پانچوں نظریئے ہمارے سامنے ہیں۔اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو جانچیں اور ہر ایک کی صحت و سقم کا فیصلہ کریں۔

ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ خود اسلام کے اندر احسان واخلاص۔صبر و توکل کی تعلیم موجود ہے اور ہادی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے رفقاء کی زندگی سراسر اُس تعلیم کی عملی تفسیر ہے۔اس صورت میں یہ کہنا کہ نفس تصوف براہ راست اسلام سے ماخوذ ہے قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ان حالات میں پہلا نظریہ جو تصوف کو خودرو پیدا وار مانتا ہے خود بخود باطل ٹھہرتا ہے۔اب رہا دوسرا اور تیسرا نظریہ جو آریائی اور مسیحی افکار کو اسلامی تصوف کی بنیاد قرار دیتا ہے۔وہ بھی تاریخی لحاظ سے نادرست ہے، کیونکہ جس زمانہ میں ہندو اور عیسائی ادب و فلسفہ مسلمانوں سے روشناس ہوا اُس سے بہت پیشتر تصوف ارتقار کی منزلیں طے کر چکا تھا۔چوتھے نظریہ کی نسبت مستشرقین کا بیان ہے کہ خود افلاطونیت جدید ایک حد تک مشرق کے تصوف سے متاثر ہوئی ہے۔یہ صحیح ہے، کہ خلافت عباسیہ کے عہد میں مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کافی مقبول ہوا اور قیاس چاہتا ہے کہ متاخرین صوفیہ اس سے کسی قدر اثر پذیر

ہوئے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک متقدمین کا تعلق ہے یہ بالکل بے بنیاد ہے۔

اب پانچواں نظریہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی تصوف تمام تر تعلیمات اسلام سے ماخوذ ہے، ہمیں اس سے جزءً اتفاق ہے اور جزءً اختلاف۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ نفس تصوف اسلام کے اندر موجود ہے بلکہ عین اسلام ہے۔ لیکن متاخرین کا تصوف جو اچھا خاصہ فلسفہ بن کر رہ گیا ہے اور جس میں بہت سے زائد عقائد و اشغال شامل ہو گئے ہیں ہرگز خالص اسلامی تصوف نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توضیح آپ کو آئندہ سطور میں ملے گی، مگر اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اسلامی کی مختصر تاریخ عرض کر دی جائے۔ تاکہ اس کی مختلف دَور سامنے آجائیں۔ یوں تو تصوف کا سلسلہ خاص حضور پُرنورؐ اور آپ کے جلیل القدر اصحابؓ تک منتہی ہوتا ہے، لیکن پہلے شخص جو صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابوہاشم کوفی معاصر سفیان ثوری تھے۔ بعض کے نزدیک اس لقب سے پہلے مشہور ہونے والے جابر بن حیان کوفی تھے۔ یہ دونوں بزرگ دوسری صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ ان سے پیشتر جو حضرات زاہدانہ زندگی بسر کرتے اور پبلک لائف سے کنارہ کش رہتے اُن کے شرف کے لئے صحابی یا تابعی کا لقب کافی سمجھا جاتا تھا۔ ابوہاشم کے زمانہ کے لگ بھگ ابراہیم ادہم۔ داؤد طائی فضیل بن عیاض اور رابعہ العدویہ مشہور صوفی ہوئے۔ جن کے زہد وعبادت کے واقعات سے تمام تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ تصوف کے ابتدائی مصنفین میں یحیٰی بن معاذ رازی۔ سید الطائفہ جنید بغدادی شیخ ابونصر سراج طوسی، امام ابوالقاسم قشیری خراسانی اور شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت بایزید اور شیخ جنید سے پہلے تصوف ایک خاص قسم کی زاہدانہ اور قناعت پسندانہ زندگی کا نام تھا، ان دونوں بزرگوں نے وحدت الوجود

کا نغمہ اس نے سے چھیڑا کہ در و دیوار گونجنے لگے۔ ان کے مدتوں بعد شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت وجود کو جواب تک ایک وجدانی اور ذوقی چیز سمجھی جاتی تھی ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا دیا اور تصوف کو خالص فلسفہ بنا دیا۔ اُن کی تصانیف آج تک خواص اہل علم میں اس فن کے غوامض اسرار کی حامل مانی جاتی ہیں۔ خدا رحمت کرے امام غزالی پر کہ انہوں نے شیخ اکبر کے بعد اپنی مجتہدانہ تصانیف سے اسلامی عقائد کو اُن کی اصلی صورت میں پیش کیا اور تصوف کو فلسفہ کی غلامی سے بچا لیا۔ تاہم فارسی شعرا مثلاً سنائی۔ عطار۔ رومی۔ عراقی۔ اوحدی۔ شبستری۔ خسرو۔ حافظ۔ جامی نے اپنے اپنے دور میں تصوف کی مئے مردافگن جس میں وحدت الوجود کی چاشنی نمایاں تھی۔ اس ذوق و شوق سے پی اور پلائی کہ زمین و آسمان سرشار ہو گئے۔ آخر ہمارے ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی کا ظہور ہوا جنہوں نے وحدت وجود کے مقابلہ میں وحدت شہود کا عقیدہ ثابت کیا اور اتباع کتاب و سنت پر بہت زور دیا۔ آخر عہد میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی بلند پایہ تصنیفات میں دونوں عقیدوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔

یہ تاریخ تصوف کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس سے تصوف اسلام کے ارتقاء کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عہد سعادت کا تصوف بعد کے عجمی تصوف سے کس قدر متغائر ہے۔

دراصل متاخرین کا تصوف عبارت ہے چند مخصوص عقائد و اعمال اور ایک خاص قسم کی متمائز زندگی سے جو اُن عقائد و اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہاں تصوف کی مختلف تعریفات اور صوفیہ کے مختلف خیالات کی تفصیل کا محل نہیں۔ صرف اجمالاً اُن مخصوص عقائد و اعمال کا تذکرہ کر دینا کافی ہو گا۔

عقائد میں سب سے پہلے وحدت الوجود یا توحید وجودی کا عقیدہ آتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے، وجود صرف ایک ہے۔ اور تمام اشیاء جو نظر آتی ہیں اسی کی تجلیات و مظاہر ہیں۔ وجود حقیقی اور کائنات میں ذات وصفات کی نسبت ہے۔ اور چونکہ صفات عین ذات ہیں۔ کائنات کا بھی حق تعالیٰ سے الگ کوئی وجود نہیں۔ بلکہ سب وہی ہے، شیخ ابن عربی کا قول ہے سبحان[1] من خلق الاشیاء، وہو عینہا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ الرب[2] حق والعبد حق فیا ورِی مَن المکلف۔ اسی قول سے تخلیق عالم کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے یعنی وجود بسیط۔ یا ذات بحت جس کو جیلی نے العمیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے لاتعین کی شان سے متصف تھی۔ جب وہ اس کی مقتضی ہوئی کہ خود اپنے کو پہچانے تو اُس نے تعینات یا تنزلات کی جانب رجوع کیا جن کو عالم یا کائنات کہا جاتا ہے۔ عالم دو ہیں۔ عالم مثال اور عالم ظاہر۔ عالم کے اجزا ہر آن وجود حقیقی کی طرف سے فیضان وجود آنے اور منقطع ہونے کی بنا پر بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ اسی کا نام تجدد امثال ہے رہے اعمال تصوف۔ وہ بھی دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ جو بڑی حد تک مقصود بالذات ہیں۔ مثلاً محبت۔ رضا۔ زہد۔ تقویٰ۔ صبر۔ شکر۔ قناعت، سخاوت وغیرہ۔ دوسرے وہ جو مقصود بالغیر ہیں۔ مثلاً ذکر۔ فکر مراقبہ۔ ارادت۔ بیعت۔ خرقہ۔ ریاضت۔ مجاہدت وامثالہا۔

یہ مخصوص افکار و اشغال کیونکر پیدا ہوئے! اسلام تو خدا کی وحدانیت کیساتھ

---

[1] پاک ہے وہ ذات جس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا درانحالیکہ وہ عینِ اشیاء ہے۔

[2] خدا بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ مجھے نہیں معلوم پھر مکلف کون ہے۔

اس کے خلاقیت ربوبیت۔ رزاقیت اور انسان کی مخلوقیت۔ عبودیت اور مرزوقیت کا بہانگ دہل اعلان کر رہا ہے، ہوالذی خلقکم من طین۔ وہی خدا ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ وہی رب العالمین۔ وہی رزاق ذوالقوۃ المتین ہے۔ جس کی شان پاک ہے۔ ہو یطعم ولا یطعم[1] اور ظاہر ہے کہ مطعِم اور مطعَم ایک نہیں ہوسکتے۔ تخلیق کی غایت خود قرآن کے الفاظ میں یہ ہے ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ ہم نے جن اور انسان کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہمارے حضور میں اپنی عبودیت کا اعتراف کریں۔ اگر اس عقیدے کو نہ مانا جائے تو نیک و بد کا امتیاز۔ شیخ و برہمن کا فرق۔ اسلام و کفر کا تفاوت۔ انبیا کی بعثت۔ شرائع کی غایت۔ انسان کی تکلیف اور مسئولیت سب لغو ٹھہرتی ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ صوفیہ متاخرین نے بہت سے خیالات غیر شعوری طور پر فلاسفہ[2] یونان سے اخذ کر لئے ہیں۔ یہی حال اکثر اشغال و مجاہدات کا ہے جو باہر سے تصوف میں داخل ہو گئے ہیں۔

آخر صوفیہ کے پاس اس کا کیا جواب ہے سنئے۔ صوفیہ اپنی تائید میں تین چیزیں پیش کرتے ہیں۔ نقل۔ عقل اور کشف۔

سب سے پہلے ہم نقل کو لیتے ہیں۔ جس سے مراد قرآن و حدیث ہے۔ مثلاً وحدت الوجود کے ثبوت میں وہ اکثر ان آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ ہوالاول

---

[1] وہ سب کو روزی دیتا ہے اور اس کو کوئی روزی نہیں دیتا۔

[2] اعلم ان الاشراقیین من الحکماء دالالہیین کالصوفیین فی المشرب والاصطلاح (کشف الظنون)

والآخر والظاہر والباطن خدا ہی اوّل وآخر ہے۔ خدا ہی ظاہر و باطن فاینما تولوا فثم وجہ اللہ تم جدھر بھی رخ کرو اُدھر خدا کی ذات ہے۔ ہو معکم اینما کنتم خدا تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ الا انہ بکل شیٔ محیط جانتے رہو کہ خدا ہر شے پر حاوی ہے، وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا کہ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے اس لئے جو کوئی عبادت کرتا ہے اُسی کی کرتا ہے۔ علیٰ ہذا احادیث میں لو انکم دلیتم بحبل الی الارض السفلی لہبط علی اللہ اگر تم سب سے نیچے کے طبقہ زمین پر رسی سے ڈول ڈالو تو وہ خدا تک پہونچے گا۔ یا لاتسبوا الدہر فان الدہر ہو اللہ زمانہ کو برا نہ کہو اس لئے کہ اللہ ہی زمانہ ہے، وغیر ذلک[1] پیش کرتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ کسی نص قرآن یا حدیث کا مفہوم متعین کرنے کے لئے بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ ادبیت وعربیت میں تبحر۔ لغات عرب اور اشعار جاہلیت پر عبور سرور عالمؐ اور صحابہؓ کی روایات پر اطلاع اسباب نزول پر نظر۔ سیاق و سباق کا خیال۔ دوسری نصوص واردہ کا تتبع۔ اگر یہ سب چیزیں موجود نہیں تو وہ تفسیر، تفسیر بالرائے اور وہ تاویل، تاویل الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ کی مصداق ہو گی ہیں افسوس ہے کہ حضرات صوفیہ کا استدلال اکثر اسی قبیل کا ہے۔ احادیث جو صوفیانہ تصانیف میں استشہاداً لائی گئی ہیں بیشتر روایت کے اصول سے بھی

---

[1] آیات بالا کا سیاق بتاتا ہے کہ یہاں خدا کی عظمت کا بیان مقصود ہے۔ نہ کہ خدا اور بندہ کی عینیت کا۔ رہیں احادیث تو پہلی کسی مستند کتاب میں نہیں ملی۔ دوسری میں یہ بتایا ہے کہ خدا ہی متقلب دہر ہے۔ دہر کا کیا قصور۔

غیر مستند ہیں۔

ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کیف تکفرون باللہ[۱] وکنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون کی تفسیر میں علامہ روزبہان اپنی تفسیر عرائس البیان میں لکھتے ہیں۔ کنتم امواتا بالظاہر فاحیاکم بمکاشفۃ الاسرار۔ ثم یمیتکم عن اوصاف العبودیۃ ثم یحییکم باوصاف الربوبیۃ ثم الیہ ترجعون عند تحیرکم عن ادراکہ اسی آیت کریمہ کے بارہ میں شیخ اکبر فرماتے ہیں۔ ثم یمیتکم عن انفسکم بالموت الارادی الذی ہو الفناء فی الوحدۃ۔ ثم یحییکم بالحیاۃ الحقیقیۃ التی ہی البقاء بعد الفناء بالوجود الموہوب الحقانی ثم الیہ ترجعون للشاہدۃ اوالشہود۔ وقودہا[۲] الناس والحجارہ میں حجارہ سے کیا مراد ہے۔ لکھتے ہیں۔ اے الامور الحاسیۃ السفلیۃ الصامتۃ التی تعلقوابہا بالمحبۃ فرسخت صورہا فی انفسہم۔ قرآن حکیم میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کا قصہ آیا ہے شیخ کے نزدیک آدم سے مراد قلب ہے۔ اور سنیئے بیٹوں سے کیا مقصود ہے ہما ہابیل العقل و قابیل الوہم۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاد کا حکم دیا ہے۔ وہاں جہاد ہی مطلوب ہے مگر کس سے؟ قاتلوا[۳] الذین یلونکم اے من کفار قوی نفوسکم التی ہی اعدیٰ عدوکم۔ یعنی قوائے نفس کے کفار سے جہاد کی تاکید ہے۔ ایک موقع پر حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ اور اُن کے حقیقی بھائی کو سرقہ سے منسوب کیا ہے۔ اس کے

---

[۱] تم کیونکر اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ جب تم بیجان تھے اسی نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر موت دیگا۔ پھر زندہ کریگا پھر اسکی طرف تم لوٹائے جاؤگے صوفی حضرات نے زندگی اور موت سے روحانی زندگی اور موت مراد لی ہے۔

[۲] اس دوزخ کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ صوفیہ نے حجارہ (پتھر) سے وہ اسباب سفلی مراد لئے جن سے کسی کو محبت ہو جائے۔

[۳] اپنے قریب والوں سے جنگ کرو۔

متعلق صاحب عرائس البیان کی تلاش سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں فسرق[1] بعضہم قماشۃ الظاہر و یوسف سرق بنرجس عینہ المخمورۃ و ورد خدہ المصبوغ بہ صبغ اللہ قلوب العالمین

احادیث کا بھی اکثر یہی عالم ہے۔ بلکہ وہاں ضعاف و موضوعات کی بھی کمی نہیں۔ اس قسم کی روایات کی ضرورت کیا پڑی۔ اس کا جواب صاحب نیل الامانی کے الفاظ میں سنیئے۔ ومنہا قصد الاجر والثواب فی زعم الواضع کما فعلہ قوم ینتسبون الی الزہد والصلاح جہلاً منہم بما یجوز لہم وما یمتنع یعنی وضع روایات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بعض لوگوں نے نیک نیتی سے ثواب کی غرض سے ایسا کیا۔ جیسا کہ زہاد نے جائز و ناجائز کی لاعلمی میں احادیث وضع کیں۔ چنانچہ ایک زاہد ابو داؤد نخعی کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ قیام لیل اور صیام نہار کے نہایت پابند تھے مگر احادیث وضع کرتے تھے۔ یہی حال وہب بن حفص کا تھا جنہوں نے عبادت کی مشغولیت کے باعث ۲۰ سال تک کسی سے کلام نہیں کیا تھا۔ بعض اہل زہد نے اعتراف کیا کہ ہم نے اس غرض سے فضائل قرآن کی روایات وضع کیں کہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر فقہ ابی حنیفہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ حضرات صوفیہ کی جن روایات پر محدثین محققین نے وضعی یا قریب بہ وضعی ہونے کا حکم لگایا ہے ان کے استقصار کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ مشتے نمونہ از خروارے حاضر ہے۔

من[2] عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ ابن تیمیہ نے اس کو موضوع کہا ہے۔ سمعانی کا بیان ہے کہ یہ حدیث مرفوع

---

[1] یعنی بعض نے ظاہری سامان چرایا اور حضرت یوسفؑ نے اپنی نرگس چشم اور گل رخسار سے (جو حسن ایزدی کی مستی اور رنگ سے سرشار اور رنگین تھے) اہل عالم کے دل چرائے۔

[2] موضوعات کبیر ملا علی قاری۔ ولآلی مصنوعہ علامہ سیوطی۔

نہیں ہے۔ بلکہ یحیی بن معاذ کا قول ہے۔ من عشق فعف فکتم فمات مات شہیدا جو عشق میں پاکباز رہے اور اُس کو پوشیدہ رکھے تو اس کی موت شہید کی موت ہو گی۔ یحیی بن معین نے یہ روایت سنکر کہا کہ اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو میں اس کے راوی سے جہاد کرتا۔ موتوا قبل ان تموتوا مرنے سے پہلے مرجاؤ عسقلانی نے اس کو بے اصل کہا ہے۔ کان اللہ ولاشئی معہ وھو الآن کما کان۔ اللہ تھا اور کچھ نہ تھا اور وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا ملا علی قاری کی تحقیق یہ ہے کہ آخری ٹکڑا صوفیہ کا کلام اور وجودیہ کا اضافہ ہے کنت کنزاً لا اُعرف فاحبت ان اعرف فخلقت خلقاً یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس لئے میں نے خلق کو پیدا کیا۔ زرکشی اور عسقلانی کا ارشاد ہے کہ لایُعرف لہ سند (اس حدیث کی سند مجہول ہے) اذا صدقت المحبۃ سقطت شروط الادب جب محبت سچی ہوتی ہے تو ادب کی شرائط ساقط ہو جاتی ہیں۔ ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ حضرت جنید کا کلام ہے۔ حدیث رسولؐ نہیں۔ اوّل ما خلق اللہ العقل پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے، بعض نے اس کو موضوع اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے۔ تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستۃ، ایک گھڑی کی فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے یہ حضرت سری سقطی کا قول ہے۔ حدیث نہیں۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے یہ جندب کا قول ہے۔ رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر۔ ہم جہاد اصغر (غزوہ) سے جہاد اکبر (مجاہدہ نفس) کی طرف لوٹے عسقلانی نے بتایا ہے کہ یہ بھی صوفیہ کے اقوال میں سے ہے۔ الفقر فخری فقر میرا فخر ہے۔ عسقلانی نے فرمایا کہ یہ روایت باطل ہے من سمع صوت اہل التصوف فلا یؤمن علی دعاہم کتب عند اللہ من الغافلین۔ جو اہل تصوف کی آواز سنے اور ان کی دعا پر آمین نہ کہے تو وہ خدا کے یہاں غافلوں میں لکھا جائے گا۔

اس کی عبارت میں لفظ تصوف کا ہونا ہی اس کی وضع پر دلالت کر رہا ہے۔

علیٰ ہذا یہ روایت کہ حضرت نبی کریم نے ایک سماع میں شرکت فرمائی اور شدت وجد میں اپنا گریبان مبارک چاک کر ڈالا سراسر افترا ہے۔ ملا علی قاری کہتے ہیں کہ خدا اس حدیث کے وضع کرنے والے پر لعنت فرمائے۔ اسی طرح جناب امیرؓ کا حضرت حسن بصری کو خرقہ صوف پہنانا بھی بے اصل ہے۔ بلکہ ائمہ حدیث نے اُن کا جناب مرتضویؓ سے سماع حدیث بھی تسلیم نہیں کیا۔ تلقین جو صوفیہ میں متعارف ہے اور نسبتہ مصافحہ بھی سرور عالم تک متصلاً ثابت نہیں۔ بعض مشائخ نے نماز معکوس پڑھی ہے اور اس کو آنحضرتؐ کا معمول بتایا ہے۔ حالانکہ اس کی اسناد بالکل پادر ہوا ہیں۔ الغرض اس سلسلے میں جو آیات و احادیث بطور استناد لائی جاتی ہیں ان میں اوّل الذکر عموماً بغیر کسی صارف قطعی کے مصروف عن الظاہر اور آخر الذکر اصول روایت کے اعتبار سے کمزور ہیں۔

اب رہا عقلی استدلال۔ اس میں شک نہیں کہ متاخرین صوفیہ نے عقلی دلائل کا طوفان بپا کر دیا ہے۔ بلکہ اسلامی توحید کے سیدھے سادے مسئلہ کو خالص فلسفہ بنا دیا ہے۔ مگر یہ بھی یکطرفہ ہے۔ مثال کے طور پر وحدت وجود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ مخلوق مظہر ہے۔ جس میں صفات الٰہی جلوہ گر ہوئی ہیں۔ اور چونکہ صفات ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے مخلوق بھی خدا سے جدا نہیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مخلوق بداہتہً محل حوادث ہے۔ اور چونکہ ظاہر و مظہر ایک ہی ہیں۔ اسواسطے خدا بھی معاذ اللہ محل حوادث ٹھہرتا ہے۔ اس کے علاوہ عقائد کے بارے میں نصوص کے ہوتے ہوئے عقل کو مدار قرار دینا درست نہیں۔ عقل شرع کی حاکم نہیں۔ محکوم ہے۔ جیسا کہ

رومی فرماتے ہیں۔

لیک با خورشید و کعبہ پیش رو — ایں قیاسات و تحرّی را مجو

آخر میں کشف کا نمبر آتا ہے۔ مگر اس خصوص میں راقم سطور کو لب کشائی کا کوئی موقع نہیں۔ البتہ یہاں پر حضرت مجدد کا ارشاد نقل کرنا کافی ہے۔ چوں حقیقتِ کار معلوم گشت از توقف برآمد و بلّہ ہمہ از وست را چرب یافت و کمال را در آں بیشتر دید از مقولہ ہمہ اوست۔ ریب و شبہ بالکل برطرف شد۔ تمام کشفیات مطابق ظاہر شریعت برآمدند و سرموئے از ظاہر شریعت مخالفت ندید۔ وانچہ بعضے صوفیہ مخالف ظاہر شریعت کشف ہارا بیاں می کنند یا از سہو است یا از سکر باطن[1]۔ اس سے قطع نظر کشف ادلہ شرعیہ میں بھی محسوب نہیں۔

تصوف بذات خود ایک محمود عقیدہ ہے اور تصحیح خیال[2] و تہذیب اعمال کیلئے اس سے زیادہ کوئی موثر ذریعہ نہیں۔ لیکن ہر تحریک کی طرح آخر اس میں بھی غلو[3] سے کام لیا گیا جس کی وجہ سے متعدد علمی اور عملی قباحتیں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً۔

(۱) صوفیہ وجودیہ کے نقطہ خیال سے عام مسلمین موحدین جو حق تعالیٰ اور کائنات کی عینیت کے منکر ہیں یا مشرک ٹہرتے ہیں۔ یا ایمان باللہ سے محروم۔ اور یہ محض ہمارا منطقی استدلال نہیں۔ بلکہ صراحۃً بعض مشائخ کی تحریرات سے ثابت ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالرحمٰن لکھنوی کلمۃ الحق میں لکھتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی۔

[2] التصوف ہو تصحیح الخیال (جنید)۔ التصوف ترک کل حظ للنفس۔ (احمد نوری)

[3] لاتغلوا فی دینکم یعنی دین میں حد اعتدال سے نہ بڑھو۔ (قرآن مجید)

والحسرۃ[۱] کمال الحسرۃ علیٰ ان اکابر العلماء شرقاً وغرباً سلفاً وخلفاً قد حرّفوا الکلمۃ الطیبۃ عن مواضعہا واوّلوہا من المحکم الی المتشابہ وبدّلوا مضمونہا بالکلمۃ الخبیثۃ وہی لاالہ الاغیر اللہ فصانوا السنہم عن الشرک واشرکوا بالقلب من حیث لم یحتسبوا۔ دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں فلہم[۲] ایمان حکمی لاحقیقی مولوی نور اللہ شارح کلمۃ الحق لکھتے ہیں۔ برمذہب متکلمین معنی ایمان بہ خدا اصلاً تعقل نمی یابد زیرا کہ تصدیق واذعان بوجود چیزے موقوف است برحصول تصور آں چیز در ذہن مصدّق۔ . . . . . تصور ما بوجہ نیز برمذہب متکلمین امکانے ندارد . . . . وانچہ میگویند کہ او تعالیٰ موجود در خارج ومحیط بجملہ اشیا ست ذلک[۳] قولہم بافواہہم (بہ) مالیس فی قلوبہم۔ چراکہ نیست موجود درخارج بزعم آنہا مگر آنچہ تعبیر می کنند ازاں بہ ماسوی اللہ۔

(۲) جب عینیت امر حق ہے تو مشرک بھی موحد ہوئے۔ وقضیٰ ربک الاتعبدوا الّا ایاہ کی تفسیر اوپر گذری کہ خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی خدا کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتا۔ لہٰذا بت پرست وغیرہ بھی دراصل اُسی کی عبادت کرتے ہیں (الرسائل الالٰہیہ لابن العربی) اس پر ابن[۴] تیمیہ نے بجا ایراد کیا ہے کہ قضاء دینی اور قضاء تکوینی دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اور دونوں کو مخلوط کرنا صحیح نہیں

ف۱ :- اس کا کمال افسوس ہے کہ بڑے بڑے علمائے سلف وخلف نے مشرق ومغرب میں کلمہ طیبہ میں تحریف کی اور اس کو محکم سے متشابہ کی طرف پھیر دیا اور اُس کے مضمون کو کلمہ خبیثہ سے (کہ ماسوا کے سوا کوئی معبود نہیں) بدل دیا۔ پس انکی زبان تو شرک سے محفوظ رہی مگر بے سوچے سمجھے دل مشرک ہو گئے۔

ف۲ :- انکا ایمان حکمی ہے حقیقی نہیں۔

ف۳ :- یہ ایسی بات منہ سے نکالتے ہیں جو دل میں نہیں۔

ف۴ :- الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان۔

اس کے علاوہ لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد اس خیال کی سراسر نفی کرتی ہے۔

(۳) خدا نے اسلام وکفر۔ نیکی و بدی۔ حق و باطل کی تفریق پر زور دیا ہے اور ایک کی حمایت۔ تائید اور نصرت اور دوسرے سے عدم موالات۔ اجتناب اور نفرت کا امر کیا ہے قرآن کا ارشاد ہے وما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمت ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ اندھا اور آنکھوں والا۔ ظلمت اور نور۔ سایہ اور گرمی۔ زندے اور مردے برابر نہیں ہوتے۔ لایستوی اصحاب النار و اصحاب الجنۃ۔ اصحاب الجنۃ ہم الفائزون۔ دوزخی اور جنتی برابر نہیں۔ اپنی مراد کو پہونچنے والے جنتی ہی ہیں۔ اگر کہا جائے کہ ہم بھی ان میں تغایر مانتے ہیں۔ گو اعتباری ہے مگر اس کا کیا علاج کہ عینیت کی رو سے پھر بھی اُن کی حقیقت کا متحد ہونا لازم آتا ہے۔ مالکم[۵۲] کیف تحکمون۔

علاوہ بریں حق تعالیٰ نے اپنے کلام میں کافروں اور ظالموں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور مومنین متقین کو بشارتِ رحمت دی ہے۔ معاذاللہ کون کہہ سکتا ہے کہ ملعون اور مرحوم میں اور نیز ملعون ولاعن میں اتحاد ممکن ہے۔

(۴) حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امور دین خصوصاً توحید کی تبلیغ اس اہتمام۔ اعلان اور وسعت کے ساتھ فرمائی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہر ہر مسئلہ کی

---

۵۱ :- اے کافرو میں نہیں پوجتا اس کو جسے تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو اُسکو جسے میں پوجتا ہوں (قرآن)

۵۲ :- تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

تکرار اور اشاعت کرکے ارشاد ہوتا تھا اللّٰھم ہل بلّغت[۵۱]. اللّٰھم اشہد عقل نہیں چاہتی کہ ایسے اہم مسئلہ کے بارے میں جو ام الاصول راس الایمان اور مناط نجات ہو سکوت وابہام برتا ہو۔ جبکہ غسل وطہارت کے معمولی مسائل کے جزئیات تک صحابہ کو تعلیم فرمادیے۔

(۵) بلکہ لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ خود سید الموحدین علیہ السلام اور آپ کے آل واصحاب اس خاص قسم کے عقیدے سے بے خبر تھے۔ کیونکہ آپکے اقوال وافعال میں اسکا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

(۶) اس طور سے مذہب میں تاویلات کا دروازہ کھل گیا۔ ظاہر ہے کہ صارف قطعی کے بغیر نصوص ظواہر میں تاویل کرنا۔ جائز نہیں۔ ورنہ شرع سے امان اٹھ جائیگی۔ اور دین کی غایت اصلی فوت ہو جائے گی۔ چند نمونے جو اوپر گذرے اُن سے اندازہ ہوا ہوگا۔

(۷) نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام جو ملّت سمحا اور طریقہ بیضا کا مصداق ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں کا مجموعہ بن گیا۔ اور وہ دین جو ایک طرف ابوبکر و علی۔ عبداللہ بن مسعود وعبداللہ بن عباس۔ ابن سلام اور کعب احبار کے دلوں کو اپیل کرتا تھا تو دوسری طرف امیین عرب اور اہل بادیہ کی فطرت کو۔ ایک جانب ایران وشام کے متمدن دماغوں کو کھینچتا تھا تو دوسری جانب بربر اور سودان کے وحشیوں کو۔ اب دور از کار چیستانوں کا دفتر ہو گیا۔ جس تک بجز اخص الخواص ہر ایک کی رسائی نہیں۔ صحیح مسلم میں ایک سیاہ کنیز کا تذکرہ ہے۔ جس سے آنحضرتؐ نے سوال کیا خدا کہاں ہے۔ جواب دیا۔

---

[۵۱]:۔ یا اللہ کیا میں نے تیرا پیغام پہونچا دیا۔ یا اللہ گواہ رہنا۔

آسمان میں۔ پھر دریافت فرمایا میں کون ہوں۔ بولی آپ خدا کے رسول ہیں۔ حکم دیا کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔ یہ مومنہ ہے۔ اللہ اکبر کہاں یہ سہولت پسندی اور کہاں وہ سخت گیری۔ کہ قد شاع الغلط[1] ..... حتی صار التوحید شرکا والشرک توحیداً فی زعم المسلمین کلہم اجمعین الا ماشاء اللہ۔ فشتان بینہما[2]۔

(۸) اسی کے ساتھ مذہب مجموعہ اضداد و مخزن تناقضات ہو کر رہ گیا۔ مثلاً ایک جگہ کہا جاتا ہے کہ واجب الوجود سبحانہ عین اشیاء ہے۔ اور دوسری جگہ کہا جاتا ہے کہ اعیان (اشیاء) نے آج تک وجود کی بو بھی نہیں سونگھی وغیر ذلک۔

(۹) یہ اسرار جب تک اہل علم کی زبان و قلم تک محدود رہے حسن ظن کا تقاضا ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی بچاؤ کا پہلو اور تاویل کی گنجائش ہوگی۔ لیکن عوام کے ہاتھوں میں پڑ کر ان کی کیا گت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص بہ آسانی کر سکتا ہے۔ ابن ماجہ اور دوسری کتب صحاح میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ تقدیر کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ناگاہ رسول مقبولؐ تشریف لے آئے اور ان کی گفتگو سن لی۔ سنتے ہی چہرہ مبارک شدت غضب سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کیا تم اس لئے پیدا کئے گئے ہو کہ قرآن کے ایک حصے کو دوسرے سے ٹکراؤ یاد رکھو گذشتہ امتیں انہیں باتوں سے ہلاک ہو گئیں۔ جب خواص کا یہ حال ہو تو سمجھ لیجئے کہ تا بہ عوام چہ رسد۔

(۱۰) بہت سے نادان صوفیوں نے اسی بنا پر اپنا پیچھا چھڑانے کو کہدیا کہ شریعت

---

[1] :- غلط خیالات اسدرجہ پھیل گئے کہ تمام مسلمانوں کے خیال میں (بہ استثنائے چند) توحید شرک۔ اور شرک توحید بن گیا۔ (کلمۃ الحق)۔

[2] :- ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اور ہے طریقت اور ہے۔ اس تفریق کی قباحت ہر مسلمان پر روشن ہے! اس لئے وضاحت بے سود۔ البتہ حضرت مجدد کا ارشاد ایک بار اور پڑھ لیجئے۔ انچہ بعضے صوفیہ مخالف ظاہر شریعت کشف ہارا بیاں می کنند۔ یا از سہواست یا سکر باطن۔ اسی طرح اور شطحیات ہیں۔ جن کے ذکر کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں۔

(۱۱) علم کلام میں پہلا مسئلہ جو بطور علوم متعارفہ بیان کیا جاتا ہے یہ ہے کہ حقائق الاشیاء ثابتۃ[ل] اور علم کلام پر کیا منحصر ہے۔ کوئی علم بھی ہو اُس کا نقطۂ آغاز یہیں سے ہے۔ لیکن وجود یہ حضرات کے نزدیک جب اشیاء کا سرے سے وجود ہی نہیں تو اُن کی حقائق کیسی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز میں سوفسطائیت اور نفی حقائق کارفرما ہوکر حصول علم سے مانع ہوتی ہے۔ عملی لحاظ سے مختلف امتیازات کا مرتفع ہونا یا یہ ماننا کہ امتیازات محض وہمی ہیں۔ عمرانی زندگی میں بڑی بڑی خرابیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔

(۱۲) طبائع میں جبر کی جانب میلان ان حالات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب انسان کا وجود ہی لاشے ہے تو اُس کا اختیار، اختیار پر افعال کا متفرع ہونا۔ اور افعال پر جزا کا مترتب ہونا سب عبث ہوا۔

(۱۳) صرف یہی نہیں۔ بلکہ انبیا کی بعثت اور صحف و شرائع کا ارسال بھی لغو ٹھہرا۔

(۱۴) اسی وجہ سے بہت سے قلوب میں شریعت کا وہ احترام نہیں رہتا جو ہونا چاہئیے۔ چنانچہ یہ قصہ تذکروں میں ایک بزرگ سے منسوب ہے کہ وہ کچھ معارف سنائے

[ل] نوٹ:۔ اشیاء کی حقیقتیں ثابت ہیں۔

اور وعظ فرما رہے تھے۔ کہ نماز کا وقت آگیا۔ بعض مرید خدمت میں حاضر رہے اور بعض نماز میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں سب کو نظر آیا کہ جو لوگ نماز ادا کر رہے تھے انکے منہ قبلے سے منحرف ہو گئے اور نماز باطل ہو گئی۔ اسی سلسلے میں یہ بتایا ہے کہ مرید کو شیخ کے حضور میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ خواہ کعبہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر شاہ ولی اللہ کو اپنے مکتوبات میں اس طرح تنبیہ کرنی پڑی۔ ہم چنیں جماعتے از متصوفہ کہ در زمان ما پیدا شدہ اند تکلیف شرائع را سہل گرفتہ اند و بعضے نصوص را بر مقاصد فاسدہ خود حمل نمودہ اند۔

(۱۵) عالم کو بے حقیقت جاننے کا لازمی نتیجہ ہے جائز بلکہ ضروری دنیا سے بے رغبتی کرنا۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا مقصود نہیں۔ صرف ذریعۂ وصول الی الحق ہے۔ تاہم بالکل اجتناب بھی جو رہبانیت کی حد تک پہونچ جائے درست نہیں۔ امام غزالی نے سچ فرمایا ہے، بدانکہ[1] دنیا منزلے است از منازل راہ دین و راہ گزرے است مسافراں را بہ حضرت خدائے تعالیٰ ...... بدایں مذمت کہ دنیا را کردہ آمد گمان مبر کہ ہرچہ در دنیاست مذموم است۔ بلکہ در دنیا چیزہاست کہ آں نہ از دنیاست۔ احیاء العلوم میں ایک جگہ یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔ من طلب الدنیا حلالاً تعففاً عن المسئلۃ وسعیاً علی عیالہ وتعطفاً علی جارہ لقی اللہ ووجہہ کالقمر لیلۃ البدر جو حلال طریقہ سے دنیا کو تلاش کرے تاکہ سوال کی ذلت سے محفوظ رہے۔ اپنے عیال کی مدد کرے اور ہمسایہ سے سلوک کرے تو خدا سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں

---

[1] :- کیمیائے سعادت۔

رات کے چاند کی طرح روشن ہو گا۔ اس حقیقت کے نظر انداز کر دینے سے مسلمانوں میں جو بے عملی۔ بیکاری اور سستی پیدا ہوئی ظاہر ہے۔ نہ صرف افراد بلکہ قوم کی انفعالیت اور مغلوبیت کا راز بڑی حد تک اسی میں مضمر ہے۔

(۱۶) غلو فی الدین وتجاوز عن الحدود نے ہماری قوم میں سینکڑوں بدعات پیدا کر دیں۔ عبادت کے نئے نئے طریقے۔ مجاہدے کی نئی نئی صورتیں اور قبور و مزارات پر طرح طرح کی بے اعتدالیاں ایسی نہیں جن کی مضرت اہل فہم پر مخفی ہو۔

اوپر کے بیانات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم خدانخواستہ سرے سے صوفیہ کے منکر اور تصوف کے مخالف ہیں۔ ہمارے نزدیک ہر چیز کے جانچنے اور پرکھنے کا معیار کلام اللہ اور سنت رسول ہونا چاہئے۔ جو چیز اس کے مطابق ہو وہ اخذ کر لی جائے جو مخالف ہو وہ ترک کر دی جائے۔ درحقیقت جو سچے صوفیہ کرام گذرے ہیں وہ مقتدائے ملّت و پیشوائے امت تھے۔ اور اُن کا تصوف مغزِ اسلام اور روحِ ایمان تھا۔ اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی چیز بھی مروی ہے۔ جو ظاہر شریعت کے مخالف ہے تو برتقدیرِ صحت روایت ظنّوا المومنین خیراً کے بموجب اُس کی مناسب تاویل ضروری ہے البتہ اصل معیار وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

امام مالک نے کیا خوب فرمایا ہے کہ رسولؐ معصوم کے سوا ہر شخص سے اُس کے قول کا مواخذہ کیا جائے گا۔ اس لئے ہمارا غرض ہے کہ "تصوف۔ شریعت۔ طریقت۔ کلام" ہر چیز کو رسولؐ معصوم کے ارشاد کی کسوٹی پر پرکھیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و سرِ طرۂ یارے گیرند

علی گڑھ۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء　　　　ضیاء احمد ایم، اے بدایونی

حضرت امام غزالیؒ

(از جناب ملک حامد حسین صاحب)

امام غزالی کی شخصیت تاریخ اسلام میں ایک خاص حیثیت کی مالک ہے اور ان کا فلسفہ ایک خاص نقطہ نظر کا آئینہ دار ہے۔

جس طرح فردوسی نے ایرانیوں کے مردہ قالب میں ایک تازہ روح پھونک دی امام غزالی بھی تاریخ اسلام کے لئے مجدد اور زینت ہونے والے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بڑا آدمی زمانہ کا پیدا وار ہو مگر ایک مجدد زمانہ سے بہت آگے ہوتا ہے۔ اور اپنی پیش روی کے باعث وہ بہت ہی انوکھی ہستی تصور کیا جاتا ہے۔ رفتار زمانہ سے سازباز کر لینا بہت معمولی کام ہے۔ پھر وہ کس دل ودماغ کے مالک ہوتے ہوں گے جو اسلام اور جاہلیت وحق اور باطل میں کسی قسم کی مصالحت کا خیال بھی نہیں کرسکتے۔ جو دودھ سے پانی کے تمام اجزا چھانٹ کر الگ کر دینا چاہتے ہیں۔ اور جن کا مقصد حیات ہی یہ ہو کہ وہ زندگی کے خفیف سے خفیف جز میں بھی حق و باطل کے امتزاج کے روادار نہ ہوں۔ امام غزالی کی شخصیت وہ ہے جس پر ہزاروں نے کافر وزندیق ہونے کی تہمت لگائی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ علما زمانہ وزاہدان عصر نے اپنے دستار ہائے ادب کو ان کے قدموں تلے رکھنا فخر ومباہات بھی سمجھا ہے۔ امام موصوف نے ایک تو کفر والحاد عقلیات اور ضعف الاعتقادی کے بڑھتے ہوئے طوفان کا سدباب کیا جس کے جراثیم یونانی فلسفہ کے ذریعہ اسلامی معاشرت میں ہیضہ کی طرح سرعت سے پھیل رہے تھے۔ دوسرے قلب ونظر کی سرسبز وشاداب

گھاٹی کی طرف رہنمائی کی جہاں پہونچ کر الہیات کے سارے بھید انسان کے ذہن پر آشکارا ہو جاتے ہیں۔ جہاں رسائی حاصل کر کے منصور حلاج انا الحق پکار اٹھا ہے خلفاء راشدین کے بعد اسلام عقلیات و علم کلام کے گورکھ دہندھوں میں الجھ کر ظاہریت کا ایک عجیب معجون مرکب بن گیا تھا۔ چونکہ سارا دینی جذبہ علم کلام و مناظرات کی شکل میں زبان پر آگیا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کے دل روحانیت سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ پیغمبر کی نورانی شخصیت کا اثر صحابہ۔ تابعین و تبع تابعین سے گذر کر نومسلم کے دلوں سے اٹھتا جا رہا تھا۔ امام غزالی نے بہت حد تک اس کمی کو پورا کیا۔ اس طرح امام موصوف نے اسلام کی کشتی کو جو غیر اسلامی تھپیڑوں سے ٹکرا کر بہت جلد فنا ہو جاتی ایک بار بچا لیا۔

دنیا میں سینکڑوں اور ہزاروں دین کے عالم اور فلسفہ کے ماہر پیدا ہو چکے ہیں۔ لیکن امام غزالی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان کی زندگی اور تصانیف میں اس درجہ گہرا ربط قائم ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ امام صاحب نے جو کچھ تصنیف کیا ہے تقلید کی راہ سے ہٹ کر اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر لکھا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ان کی باطنی ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنی روحانیت کے ارتقا کے متعلق انہوں نے خود ایک رسالہ تصنیف کیا تھا جس کا انگریزی نام (Confessions of Al-Ghazali) ہے۔ اس میں انہوں نے سوانح نگاری کے طرز پر اپنی شروع کی قلبی و ذہنی کیفیات و پھر نور ایمان کے حاصل ہو جانے کا صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے یہ بتلایا ہے کہ کسی دہریہ کی بے اعتقادی نہ تو علم کلام کی سخت حجت سے دور کی جا سکتی ہے اور نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہی اسکے

دل میں لوز ایمان پیدا کرسکتی ہیں۔ بلکہ انہوں نے علم العقاید کی بنیاد باطنی معرفت پر رکھی ہے۔ جو مادراے عقل ہے۔ یہیں سے تصوف کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ امام غزالی نے پرانی بنیادوں پر ایک بڑی عظیم الشان عمارت بناکر کھڑی کردی۔ اور انہیں کے زمانہ سے تصوف شریعت اسلام کا موید و مددگار بن گیا ان تمام باتوں سے باخبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ امام صاحب کی زندگی کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے جائیں۔

۱۰۵۹ء میں امام صاحب خراسان کے مشہور و معروف شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے پدر بزرگوار ایک پاک باز درویش تھے جو بقول ایک عرب مورخ "محض اپنی کمائی پر گزر اوقات کرتے وہ فقیہوں کی صحبت میں اکثر آتے جاتے جب کبھی وہ ان کے مناظرات کو سنتے زار زار روتے اور دعا کرتے کہ خدا مجھے ایک ایسا لڑکا عطا کر جو فقیہہ ہو۔" وہی مورخ لکھتا ہے کہ "خدا نے اس کی دعاؤں کو قبول کیا اور الغزالی فقیہوں کا سردار اور اپنے زمانے کا امام بن گیا" غرض کہ وہ بچپن ہی سے ایک مذہبی ماحول میں تربیت پاتے رہے۔ اگر انکا ماحول مذہبی نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ بہت بڑے متشکک فلسفی اور نیچری ہوتے۔ امام صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کی تعلیم ان کے باپ کے انتقال کے بعد ایک صوفی دوست کی نگرانی میں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد وہ جرجان کو کوچ کرگئے۔ جہاں ابوالنصر اسمٰعیل کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا آخرکار اُن کی بے چین طبیعت اور تعلیمی اضطراب نے انہیں امام الحرمین کی شاگردی کا بھی شرف بخشا۔ جو اس زمانہ میں دارالعلوم نظامیہ کے ایک معزز استاد تھے امام غزالی ذاتی قابلیت اور استعداد رکھنے کی وجہ سے "بحرالعلوم" کہلاتے تھے اس زمانہ میں

یہ رواج تھا کہ استاد اپنا درس ختم کرنے کے بعد کسی ایک ذہین شاگرد کو منتخب کر لیتا۔ جس کا کام یہ ہوتا کہ وہ اپنے استاد کے بتائے ہوئے درس کو اپنے ہم سبق طالبعلوں کے سامنے دہرا دے تاکہ مضامین اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ یہ منصب جس کو حاصل ہو جاتا وہ "معید" کہلاتا تھا۔ امام صاحب کو اپنے دور طالبعلمی ہی میں یہ شرف حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے استاد کی اور دوسری حیثیتوں سے بھی مدد کیا کرتے تھے۔ نشاپور میں انہوں نے فقہ۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاقیات۔ منطق۔ صوفیانہ اصولوں میں مہارت پیدا کی۔ اسی اثنا میں انہوں نے خود تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اور غالباً اسی زمانہ سے انھیں علم و یقین کی حقیقت اور ماہیت میں بھی شک ہونے لگا۔ امام صاحب اپنی طالبعلمانہ زندگی ہی میں ایک بلند شخصیت کے مالک تھے۔ امام الحرمین کو انپر ناز تھا۔ اور جب تک زندگی نے امام الحرمین سے وفا کی غزالی بھی ایفائے صحبت میں پیچھے نہ ہٹے۔ ۱۰۸۵ء میں اپنے استاد کے انتقال کے بعد لازماً انہیں نشاپور کو ترک کر کے زندگی کے میدان میں قدم رکھنا پڑا۔ اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی بھی علم و فضل کے اعتبار سے انکا ہمسر و ہمرتبہ نہ تھا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ خاندان عباسیہ روبہ انحطاط ہو چکا تھا اور سارے اسلامی عالم کی باگ ترکوں کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ خاندان سلجوق ترکی حکمرانوں کا بہت ہی معزز اور طاقتور خاندان رہ چکا ہے اور انکا سب سے شاندار فرمانروا ملک شاہ سلجوقی خیال کیا جاتا ہے جس کے متعلق ابن خلقان تعریفانہ انداز میں لکھتا ہے۔

"ملک شاہ کی سلطنت نے وہ وسعت حاصل کی کہ کوئی سلطنت اس حد تک نہیں پہنچی۔ اس کی سلطنت طول میں کاشغر سے لیکر جو ترکستان کا سب سے آخری شہر ہے

اورجس کی سرحد چین سے ملتی ہے بیت المقدس تک عرض میں قسطنطنیہ سے لیکر خزنہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ نظام الملک طوسی جو امام صاحب کے ہموطن تھے اس عظیم سلطنت کے عظیم الشان و باصولت وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت سلجوقیہ کی ساری ترقی اس مرد بزرگ کی ذاتی حکمت وقابلیت کی وجہ سے تھی۔ اس شخص کی داد و دہش عفو و انصاف اور علم نوازی کی وجہ سے سلطنت سلجوقیہ کا دارالخلافہ علم وفضل رکھنے والی ہستیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

امام غزالی کا مزاج ابتدا میں جاہ پسند تھا۔ دربار سلجوقیہ میں علما کی قدر و منزلت کا سماں دیکھ کر انہوں نے بھی اسی کا رخ کیا۔ امام صاحب اور نظام الملک کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی علمی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی۔ غرضکہ نظام الملک طوسی نے ان کا تعظیم وتکریم سے استقبال کیا۔ اس زمانہ میں شاہی دربار علمادین کے مناظرات کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا امام صاحب کو بھی دربار میں اپنی علمی قابلیت کا رعب بٹھانے کے لئے اسی خشک اور لاحاصل راستے سے گذرنا پڑا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنی زور تقریر و تجر علم کی وجہ سے اپنے حریفوں کا منہ بند کر دیتے۔ امام صاحب علم کا ایک جنس بے بہا لیکر نکلے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ان بلند ترین مراتب تک ترقی کی جس کا تصور اس زمانہ میں کوئی عالم کرسکتا تھا۔ یعنی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ نظامیہ بغداد کے وہ ۳۴ برس کی عمر میں شیخ مقرر ہوئے۔ یہ ایسا فخر تھا جو امام صاحب کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہوا۔ فخرالاسلام شاشی جو بہت پایہ کے فاضل تھے جب ۵۰۵ھ میں نظامیہ کے مدرس مقرر ہوئے اور مسند پر جاکر بیٹھے تو ان پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور بار بار عربی کا ایک

شعر پڑھے جس کے معنی یہ ہیں۔

"ملک بڑوں سے خالی ہوگیا تو میں ہی سردار بنا۔ اور میرا سردار بنا ملک کی بدنصیبی ہے" نظامیہ کی مدرسی کا منصب ایسا عظیم الشان رتبہ تھا کہ درحقیقت بڑے بڑے اہل کمال و علماء دین تا زندگی اس کی آرزو کرتے رہے مگر ان کی آرزو کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوئی۔ اس جلیل القدر منصب پر فائز ہو جانے کی وجہ سے مذہبی۔ علمی۔ سیاسی حیثیت سے انکا مرتبہ بہت ہی بلند ہو گیا۔ اس زمانہ میں خاندان سلجوق و آل عباس جاہ وجلال کے صرف دو ہی مرکز تھے۔ امام صاحب دونوں دربار میں محترم اور معتمد تصوّر کئے جاتے تھے۔ سیاسیات میں اس قدر دخل حاصل تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی مسائل میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیجاتی تھی۔ ایک دفعہ ترکان خاتون اور آل عباس میں خطبہ وسکہ کے متعلق اختلاف رونما ہوا۔ آل عباس کسی طور سے بھی اس امر پر راضی نہ ہوتے تھے کہ سلطنت سلجوقیہ میں آل سلجوق کا خطبہ وسکہ رائج ہو۔ یہ مسئلہ طول کھینچ گیا۔ جب جنگ وجدال کی نوبت پہونچ گئی۔ تو امام صاحب کو سفیر بنا کر روانہ کیا گیا۔ انہوں نے اپنے حسن تقریر کے اثر سے خاتون کو راضی کر لیا۔ اور اس طرح ایک بڑا فتنہ فرو ہو گیا۔ مذہبی معاملات میں بھی ان کی رائے کو وقعت حاصل تھی۔ اسی زمانہ میں فرقہ باطینہ نے اتنا زور پکڑا کہ اسلام کے مستقبل کے لئے ایک مہیب خطرہ پیدا ہو گیا۔ امام صاحب نے جو شافی مذہب تھے خلیفہ مستظہر باللہ کی فرمائش پر فرقہ باطینہ کو باطل کرنے کیلئے ایک کتاب تصنیف کی جس کو خلیفہ مذکور کے نام سے منسوب کیا۔ اور اس کا نام مستظہر رکھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب کو شاہی خاندانوں میں کس درجہ اثر ورسوخ حاصل تھا۔

بغداد میں درس و تدریس کا سلسلہ ظاہری حیثیت سے بہت کامیاب رہا لیکن اس زمانہ میں امام صاحب فلسفہ کا بہت دقیق مطالعہ کرتے رہے، ٹی۔ جی۔ ڈوبویر نے تاریخ فلسفہ اسلام میں لکھا ہے" انکا تحصیل فلسفہ کا محرک خالص ذوق علم نہ تھا بلکہ عقلی شکوک کو حل کرنے کی تمنا ان کے دل میں بسی ہوتی تھی۔ ان کا مقصود نہ تو آفرینش عالم کا سراغ لگانا اور نہ اپنی قوت خیال کی ماہیت معلوم کرنا۔ بلکہ اطمینان قلب و معرفت الہٰی حاصل کرنا تھا" غرضکہ انہوں نے ابن سینا و فارابی کا گہرا مطالعہ کیا۔ جنہوں نے یونانی نظام فلسفہ کو بعینہٖ عربی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ اس فن میں کمال حاصل کرنیکے بعد انہوں نے ایک فلسفیانہ قاموس لکھی جو دوسروں کے افکار و خیالات کا ایک مرقع تھی اس کتاب میں انہوں نے اپنی رائے کو ذرہ بھی دخل نہیں دیا۔ اس طرح انہوں نے فلسفہ کے خلاف جد و جہد کرنے کے لئے ایک ہموار پس منظر تیار کیا۔ لیکن فلسفہ کی باریکیاں بھی ان کے شکوک و شبہات کا خاطر خواہ حل تلاش نہ کر سکیں۔ علم کلام و مناظرہ سے وہ پہلے ہی برگشتہ خاطر ہو گئے تھے دوسری طرف یہ جاہ و جلال اور نمود و نمائش کی زندگی ان کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کو کسی طرح بھی پسند نہ آئی۔ انہوں نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اُس وقت میرے دل میں ایک پیہم کشمکش جاری تھی۔ کبھی شاندار عہدے کی طرف رغبت ہوتی اور کبھی دنیا کے گورکھ دھندھوں سے متنفر ہو جاتا اور خیال آتا کہ اس زندگی کو ترک کر کے باطنی زندگی کی طرف رجوع کیا جائے ضمیر انہیں بار بار پکارتا کہ تم اس کمینی اور ذلیل دنیا کو ترک کر دو۔ تمہارا مقام اس سے بہت بلند ہے۔ تم اس گندے سمندر کی شناوری کے لئے نہیں بنائے گئے ہو بلکہ تمہارا فرض کچھ اور ہی ہے۔

تمہاری زندگی کے بہت کم دن باقی رہ گئے ہیں۔ مسند سے اُٹھ پڑو کمر باندھ لو۔ کیونکہ عاقبت کی راہ بہت دشوار گذار ہے۔

اس روحانی اضطراب کے اثر سے ان کی تندرستی خراب ہوگئی۔ بھوک جاتی رہی! ور قوت ہاضمہ نے جواب دیدیا اس ذہنی تذبذب کے باعث وہ کچھ دنوں تک ایک لفظ بھی نہ بول سکتے تھے۔ اسی حالت میں وہ بغداد کی زندگی کو خیرباد کہہ کر عالم اسلامی کے سفر پر روانہ ہوگئے اور دس برس کی مسلسل سیر و سیاحت میں عام مسلمانوں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ اپنا سارا اثاثہ مال و دولت چھوڑ کر سب سے پہلے شام کا رخ کیا۔ دمشق پہونچکر دن رات مجاہدہ و مشکافہ میں مشغول رہتے لیکن اس کی وجہ سے ان کی علمی سرگرمیوں کو زیادہ نقصان نہیں پہونچا۔ ایک دن غزالی ایک درسگاہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک معزز استاد انکی تصنیفات کو لبطور سند پیش کر رہے ہیں۔ یہ سوچکر مبادا ان کے دماغ میں غرور پیدا نہ ہوجائے دمشق سے یروشلم کو کوچ کر گئے۔ دوران سفر میں مقام خلیل پر پہونچکر انہوں نے تین باتوں کا عہد کیا جس پر تمام عمر وہ عامل رہے۔

(۱) بادشاہوں سے ترک تعلق کرنا۔

(۲) بادشاہوں کی وظیفہ خواری سے پرہیز کرنا۔

(۳) مناظرہ و مباحثہ سے احتراز کرنا۔

اس لا اپنے سیاحت سے لوٹنے کے بعد انہوں نے صرف ان مذکورہ بالا باتوں ہی سے توبہ نہ کی بلکہ ان تمام اداروں کی ذمہ داری سے بھی انکار کر دیا۔ جو سرکاری اثر میں ہوں۔ یا جن کو حکومت کی طرف سے عطیات ملتے ہوں۔ لیکن انھوں نے

اپنے مشن اور خیالات کی تبلیغ کے لئے طوس میں خود اپنا آزاد ادارہ قائم کیا جہاں وہ چند افراد کو ایک خاص طرز کی تعلیم و تربیت دیکر اپنے مقصد کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ اسکیم اپنے انقلاب انگیز مقاصد کے لحاظ سے زیادہ بارآور نہ ہوئی کیونکہ اجل نے انہیں چھ سال سے زیادہ کام کرنے کی مہلت نہ دی۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد سیاست و حکومت کی باگ مستقل طور پر جاہلیت کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ خلفاء راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس کا راج قائم ہوا۔ ان کے زمانہ میں اگرچہ وہ صدیقانہ شان اور فاروقی قوت باقی نہ تھی۔ مگر پھر بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ خلیفہ وقت اسلامی عقائد اور اسلامی علوم سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر عمل کے میدان میں بالکل کورے تھے۔ لیکن ترکی النسل بادشاہوں کے بااقتدار ہونے کی وجہ سے اسلام کو سخت نقصان پہونچا۔ ظاہراً تمام ترک بادشاہ مسلمان تھے مگر وہ علوم دینی سے ناواقف تھے۔ ان میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ قضا و افتا کے عہدوں کے لئے اہل آدمی کو منتخب کرسکتے۔ اس کے علاوہ تمام ترکی بادشاہ اسلامی جمہوریت و حریت سے یکسر بیگانہ تھے، اس لئے انہوں نے بااقتدار ہونے کے بعد مطلق العنانی طرز حکومت کو اختیار کیا۔ اس صورت میں ان کے ذاتی مفاد شرعیہ اسلامی سے عموماً ٹکراتے تھے۔ پس ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ آزادی و حریت کے چشموں کو ہمیشہ کے لئے خشک کردیا جائے۔ اجتہاد ہی ایسا طریقہ ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں نیا خون اور تازہ تخیل پیدا کرتا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کو تقلید جامد سے دور رکھتا ہے۔ مگر عیش پرست شاہان وقت کے لئے تقلید جامد ہی کا راستہ موزوں تھا۔ مشرق سے لیکر مغرب تک اخلاقی انحطاط رونما ہوگیا جس کے اثرات

سے کوئی طبقہ خالی نہ رہا۔ امرا وقت تو لہو لعب کے گرداب میں پھنس ہی چکے تھے، علماء دین نے بھی بادشاہوں کی ہوا خواہی میں اسلام کا صحیح راستہ چھوڑ دیا۔ ان میں آزادی، بے باکی اور اجتہادانہ قوت سلب ہو چکی تھی۔ شاہی درباروں۔ خاندانوں اور حکمرانوں کی عیاشانہ زندگی کی وجہ سے رعایا کی حالت بتاہ ہو رہی تھی۔ ان پر ہزاروں قسم کے ناجائز ٹیکس لگائے گئے۔ وہ فنون جو درحقیقت قوم کو ترقی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں سرے سے غائب تھے، اور ان کی جگہ ان فنون کا زور تھا جو دربار شاہی میں قدر و منزلت رکھتے تھے۔ جو سراسر مخرب اخلاق تھے اور جن سے انسانوں میں پست ہمتی۔ بزدلی۔ اور بے غیرتی پیدا ہوتی ہے۔ ان حکومتوں نے اگر کوئی خدمت انجام دی تھی، تو بس یہ کہ ایک طرف یونان روم وعجم کے جاہلی فلسفوں کو جوں کا توں اسلام میں پھیلا دیا۔ اور دوسری طرف اپنی دولت کے ذریعہ اسلامی معاشرت میں جاہلی علوم و فنون کو جاری کیا۔

یونانی فلسفہ کی اشاعت سے اسلام کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ چونکہ عالمان دین علوم عقلیہ سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس الحاد کو طاقت کے ذریعہ روکنا چاہا۔ جو علوم عقلیہ سے واقف بھی تھے وہ تمام کے تمام ارسطو اور افلاطون کے ذہنی غلام تھے۔ انہوں نے جتنی کتابیں لکھیں یا جتنے ترجمے کئے وہ سب حرف بہ حرف یونانی فلسفہ سے ملتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اسلام کا لبادہ پہن لیا تھا مگر ان کی روح یونانی تھی۔ ان میں بعض تو ارسطو کو اپنا پیغمبر مانتے تھے۔ محمدؐ کی پیروی کو خیرباد کہہ کر ارسطو کی سیادت ان کے لئے مایۂ ناز تھی۔

مذہب ان کے خیال میں صرف ایک قانون تھا اور فلسفہ ایک علم کا بحر زخار

اس لئے وہ اپنے علماء سے بری طرح نفرت کرتے جو مذہب کے سامنے بلا چوں وچرا سر جھکا دینے کے بجائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ فلسفی مذہبی احکام کی پابندی سے بالاتر سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ اشیاء کی حقیقت کا پتہ رکھتا ہے۔ مصنف تاریخ فلسفۂ اسلام ابن سینا کے خیالات اس انداز میں پیش کرتا ہے: "شرع کے احکام وریاست کے قوانین صرف عامۃ الناس کے لئے واجب العمل ہیں۔ محمدؐ کا مقصد یہ تھا کہ بدویوں کو مہذب بنائیں۔ .... اسی مقصد کے لئے انہوں نے علاوہ اور باتوں کے حشر اجساد کی تعلیم دی۔ .... سچے خدا پرست روحانی محبت میں عوام وزہاد دونوں سے برتر ہیں۔ یہ سوائے ذات احدیت کے کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتے اور امید و بیم سے آزاد ہیں۔ ان کے حصہ میں عقل کی آزادی آتی ہے۔ .... لیکن یہ راز عوام پر ظاہر کرنے کا نہیں ہے۔ فلسفی اسے صرف اپنے عزیز شاگردوں کو تعلیم دیتا ہے۔"

ابن رشد کا خیال یہ ہے کہ مذہب وفلسفہ کا امتزاج کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ مذہبی اصول وفلسفہ کے مقاصد کا مختلف ہوتا ہی انکا اتحاد ہے۔ کیونکہ مذہب ایک ظاہری چیز ہے۔ اور حق کی اعلیٰ صورت ومذہب کی برتر شکل فلسفہ ہے۔ فلسفہ سے ہمیں ان اشیاء کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو حقیقی وجود کی مالک ہیں۔ یونان زدہ فلسفی اسلامیات پر بحث کرنے سے پیشتر ہی فلسفہ کو ایک صداقت مان لیتے ہیں۔ پھر وہ اسلامی اصولوں کو توڑ مروڑ کر اسے فلسفہ سے تطبیق دینا چاہتے ہیں۔ ابن سینا و فارابی نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا مگر ابن رشد[1] تو اپنے کو اسلام سے قطعاً آزاد خیال کرتا تھا۔

---

[1] :- ابن رشد کا دور غزالی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ فلسفی فلسفہ کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ جو کچھ قرآن میں ہے اسے عوام کو بغیر کسی چوں چرا کے مان لینا چاہئے۔ اسی کو وہ حق

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹ پر

ان کے بحث کرنے کا طرز بھی عجیب تھا۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ قرآن حق ہے اور فلسفہ بھی حق ہے۔ لیکن صداقت محض ایک ہو سکتی ہے اس لئے قرآن و فلسفہ کو مماثل ہونا چاہئے۔ مسائل الہیات کو فلسفہ کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے کی گئی۔ اس سلسلہ میں بصرہ کے اخوان الصفا اور فرقہ معتزلہ کی کوششیں نمایاں ہیں۔ اخوان الصفا کے اراکین ایک رسالہ بھی شائع کرتے تھے۔ جو فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر مضمون نگار عقوبت سے بچنے کے لئے اپنا نام ہمیشہ خفیہ رکھتے تھے۔

اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت سیکڑوں فرقے اسلامی دنیا میں معرض وجود میں آچکے تھے۔ کچھ کے پیش نظر عقائد کی اصلاح تھی جیسے معتزلہ۔ اشعری۔ اور اخوان الصفا۔ لیکن یہ فتنہ اکثر سیاسی اختلافات کی وجہ سے بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ ساری اسلامی دنیا میں مذہبی و سیاسی تعصب کا عالم طاری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بزرگ ہستی کے انتقال کے بعد ان کے مریدین اپنے سیاسی وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایک الگ فرقہ کی طرح ڈالدیتے تھے، آہستہ آہستہ اسے مذہبی رنگ بھی دیدیا جاتا۔ تنگ نظری کی وجہ سے منافرت کی خلیج روز بروز وسیع سے وسیع تر ہو جاتی عموماً ایک فرقہ دوسرے کی مخالفت میں کھڑا ہو جاتا۔ جیسے فاطمیہ عباسیہ کی مخالفت میں ظاہریہ فرقہ کے پیرو کار باطنیوں کو کافر تصور کرتے۔ اسماعلیہ فرقہ کے لوگ کسانیہ وزیدیہ فرقہ کے لوگوں پر کافر و زندیق ہونے کی تہمت لگاتے۔ ان کی ساری سیاست اور انکا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۸

بتاتا ہے۔ لیکن یہ ایسا حق ہے جو طفل طبیعۃ لوگوں کیلئے موزوں ہے اور اسکی وقعت قصہ کہانیوں سے زیادہ نہیں ہے فلسفہ ایک بلند چیز ہے اور وہ حقیقی وجود کا پتہ دیتا ہے۔

سارا مذہبی جنون تعمیری کاموں کو بالائے طاق رکھ کر تخریب پر اتر آیا تھا۔ یہ تھی ان کی سیاست کی نوعیت۔

اسلام جب عرب کی سرزمین سے نکل کر مختلف ممالک میں پھیلا تو اسے ایسی قدیم تہذیبوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جو اپنے اندر مکمل نظام زندگی لئے ہوئے تھیں ہندی فلسفہ کا اثر یہ ہوا کہ قرامطہ اور سبائیہ فرقہ کے لوگ مسئلہ تناسخ کو اپنے عقائد کا ایک اہم جز سمجھنے لگے۔ فلسفہ ایران و یونان کے امتزاج کی وجہ سے اسلامی تصوف نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔ رہبانی تقدیر پرستی اور پستی انسان کی بے بساطی و کمائیگی کا نغمہ یونانی ساز نے چھیڑا۔ توکل کے معنی بے کار ہونا ایرانی فلسفہ کی تعبیر ہے۔ ہمارے شاعروں نے آسمان کے جور و ظلم و زمانہ کی سخت گیری پر لاکھوں مرثیے لکھ ڈالے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری معاری تخیل ہی اسی طلسم پر قائم ہے۔ ان کی دیوانوں کا ماحصل صرف یہ ہے کہ آسمان کے اشارہ سے آسیائے زمانہ نے انہیں بری طرح پیس ڈالا ہے۔ آسمان کو قوت ارادی سے تعبیر کرنا مسلمانوں نے اولاً یونانیوں سے سیکھا ہے۔ گرچہ ظاہراً اس قسم کے خیالات میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ لیکن انکے مہلک اثر سے ہماری غیرت و شجاعت کی تلوار میں زنگ لگ چکی ہے۔ ہم یہ سمجھ کر ہر تلخ گھونٹ کو پی جاتے ہیں کہ یہ اپنا نہیں بلکہ زمانہ کا لایا ہوا ہے جس پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ خیال ایک غلام قوم کو غفلت کی نیند سلا دیتا ہے تصوف کے میدان میں رہبانی تقدیر پرستی نے اس درجہ زور پکڑا کہ آجکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسلامی عقاید کا ایک جز لاینفک ہے۔ درحقیقت ایرانی و یونانی فلسفہ نے اسلام کی مستحکم بنیاد کو کھوکھلا کر دیا تھا لوگوں کے عقاید کمزور ہونے لگے تھے۔

قیامت۔ دیدار ذات الٰہی۔ جبر و تقدیر۔ قدم عالم۔ صفات، ذات باری تعالےٰ۔ حدث قرآن۔ اور اس قسم کے سیکڑوں مسائل زبان زد عوام بن گئے تھے۔ جنہیں عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لوگوں کو خدا کی ذات اور عقل کی ماہیت پر شک ہونے لگا۔ تصوف نے بھی دیگر فرقوں کی طرح ایک الگ فرقہ کی صورت اختیار کرنا شروع کیا۔ خلفاء راشدین کے بعد اسلام کے سیاسی میدان میں جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ اس تاریکی میں غیر جانبدار، پاک طینت اور صلح پسند مسلمانوں کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اسلامی معاشرت کو اب ان کی چنداں ضرورت نہیں پس خیر و شر سے بچنے کے لئے وہ لوگ الگ گوشہ تنہائی و گمنامی میں بیٹھ گئے تھے یہیں سے تصوف کا سراغ ملتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ صوفیوں کی شکست خوردہ ذہنیتیں رہبانیت کے پُرسکوں عناصر سے متاثر ہو کر رہبانیت سے بہت قریب ہو گئیں ...... یہ تھا وہ ماحول جس میں امام صاحب نے پرورش پائی تھی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے کہ مجدّد ہمیشہ اپنے زمانہ سے متنفر ہوتا ہے اور وہ پیدا ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ زنگ آلودہ نظام معاشرت کو صیقل دیکر چمکا دے۔ امام غزالی کی متشکک اور آزاد طبیعت کا شعلہ کبھی بھی ماحول کے خس و خاشاک سے نہ بجھ سکا۔

اس جگہ امام صاحب کی ذہنی و روحانی ارتقا کو علمی انداز میں پیش کرنا ان کی شخصیت کو زیادہ نمایاں کردے گا۔ ان کی بغداد کی زندگی اور بعد کی دس سالہ سیر و سیاحت ہی ان کے علمی انقلاب کا زمانہ ہے۔ پس یہ ظاہر کرنا بہت ضروری ہے کہ انہیں ابتدا میں فلسفہ یونان سے کس قدر ذوق تھا۔ ان کے

بعد تشکک آمیز خیالات نے ان پر کس طرح حملہ کیا۔ اس کا رد عمل ان کی علمی زندگی پر کیا ہوا۔ پھر خضر ہدایت نے کس طرح ان کے دل کو نور ایمان سے منور کیا۔ اور انہوں نے فلسفہ کے متعلق درمیانی راستہ کیوں اختیار کیا۔ اور آخر وہ کیا وجہ تھی کہ دنیا وی۔ معاملات کو ترک کر کے تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہوگئے۔ امام صاحب سے اکثر اسی قسم کے سوالات کئے جاتے تھے مثلاً یہ کہ وہ ہر دین وملّت کے اسرار و رموز کی تہہ تک کس طرح پہونچے؟ انہوں نے عالم کی پیچیدگیوں سے کس طرح نجات حاصل کی۔ اور تقلید کی خندق سے نکل کر تحقیق کی بلند چوٹیوں تک کس طرح پہونچے۔ ان سے یہ بھی دریافت کیا جاتا تھا کہ ان عقاید کی حقیقت کیا ہے جس میں انسان بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ عموماً لوگ امام غزالی کے مدرسہ نظامیہ (بغداد) سے کنارہ کشی اختیار کر لینے پر سخت متعجب تھے۔ لیکن کچھ ہی دن بعد طوس میں انکا ذاتی مدرسہ قائم کرنا اس سے زیادہ حیرت کی بات تھی۔ یہ سوالات خود اپنی زبان سے غزالی کی ذہنی و روحانی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ انکا ذہنی ارتقا متکلم کی حیثیت سے شروع ہوا۔ اور صوفیت پر جا کر ختم ہوگیا اس دوران میں انہیں تالمیت و فیلسوفیت کے بھی مراحل طے کرنے پڑے۔

امام صاحب نے اپنی ذہنی کشمکش سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں نے علم کلام اور اصول تالیمہ (فرقہ باطنیہ کا دوسرا نام ہے۔ خود امام صاحب نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ اس اصلاح کو فرقہ باطنیہ کیلئے استعمال کیا ہے) سے کیا حاصل کیا ہے

میں نے نظام فلسفہ کو کیوں رو کیا اور آخر میں صوفیوں کا طریقہ کیوں اختیار کیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں حقیقت کے اس سرمایہ سے آشنا کر دوں جو مجھے مختلف خیالات کے مطالعہ سے ملا ہے "۔

جیونہی ان میں سیاسی بصیرت بیدار ہوئی اور علم کی آنکھوں نے مذہبی ماحول کا مطالعہ کیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ساری اسلامی دنیا تفرقہ بازی کے مہلک مرض سے تشنج کے عالم میں تڑپ رہی ہے۔ عقاید کے اختلاف کو وہ ایک سمندر سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں ہزاروں جو نیدگان حق غرق ہو چکے ہیں۔ چند ہی ایسے خوش قسمت لوگ ہیں جو اس ورطہ بلا سے صحیح وسلامت واپس لوٹ آئے ہوں ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار　　　　نیامد ازاں تختہ بر کنار

انہیں محسوس ہوا کہ ہر شخص اپنے فطری مذہب پر نہیں چلتا بلکہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے والدین کے مذہب کو بلا چوں وچرا اختیار کر لیتا ہے۔ پس وہ فطرت حقیقی معلوم کرنے کی طرف منعطف ہوئے۔ وہ خود رقمطراز ہیں کہ "میں ان تفرقہ بازیوں کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچا کہ چونکہ میرا مقصد تلاش حق ہے! اس لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ایمان کے مبادیات کا تعین کر لیا جائے "۔ ایمان کے متعلق ان کی ذاتی رائے یہ ہے "ایمان اس یقین راسخ کو کہتے ہیں جو معجزہ کے باوجود بھی اپنی جگہ سے متزلزل نہ ہو"۔ اس کی آسان مثال اس طرح دی گئی ہے۔ فرض کر لو مجھے یقین ہے کہ دس تین سے بڑا ہے۔ لیکن ایک آدمی آتا ہے۔ ہاتھ میں پتھر لیکر اسے سونا بنا دیتا ہے۔ یا ایک عصا پھینکدیتا ہے اور وہ سانپ میں تبدیل ہو جاتا ہے پھر وہ کہتا ہے کہ میرے کہنے پر ایمان لاؤ کہ تین دس سے بڑا ہے۔ لیکن اگر مجھے یقین ہے کہ دس

تین سے بڑا ہے تو میں اس خرق عادت کو دیکھنے کے بعد بھی کبھی اپنی پچھلی رائے سے انحراف نہ کروں گا۔ اس مقررہ معیار پر انہوں نے اپنے تمام علم کو پرکھنا شروع کیا۔ حسیات و بدیہات سے حاصل ہونے والے علم کے علاوہ باقی تمام علم یقین کے معیار پر نہ اتر سکے۔ لیکن کچھ غور و خوض کے بعد انہیں اپنے حسی شعور پر بھی اعتبار نہ رہا۔ اس کے لئے وہ جو ثبوت پیش کرتے ہیں بہت فیصلہ کن ہے۔ حواس خمسہ میں بصیرت سب سے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ نظر ایک سایہ کو دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ وہ ساکت ہے۔ لیکن تجربے اور مشاہدے بتلاتے ہیں کہ سایہ کبھی بھی یکبارگی حرکت نہیں کرسکتا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سایہ کی قوت حرکت کبھی بھی سلب نہیں ہوسکتی۔ حسیات سے اعتماد اٹھ جانے کے بعد وہ بدیہات کی طرف رجوع ہوئے۔ انکا خیال یہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ عقلی نتائج جو بنیادی اصولوں پر تعمیر ہوتے ہیں صحیح ہوں۔ لیکن عقل کی قطعیت کا کون فیصلہ کرسکتا ہے۔ عقل کے ناقص ہونے کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ انسان نیند کی حالت میں جبکہ اس کی عقل کام کرتی رہتی ہے بے سروپا خواب دیکھتا ہے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں، لیکن نیند کی حالت میں وہی غلط خواب۔ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پس عقلِ انسان کی قطعی رہنما نہیں ہوسکتی۔ اس کے ماورا بھی ایک طاقت ہے جو ہماری عقل کو ٹھوکر کھانے سے بچاتی ہے۔ اگر وہ ظاہر نہیں ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وجود بھی نہیں رکھتی۔ اسی پوشیدہ طاقت کا نام خدا ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اب وہ محققین ذات الٰہی کے علم و عمل کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک محققین علم کی تین قسمیں ہیں (جس میں ہر ایک نے منزل مقصود تک پہونچنے کیلئے الگ الگ راستہ اختیار کیا ہے)

(۱) متکلم۔
(۲) فلسفی۔
(۳) صوفی۔

متکلم اور علم کلام

خلفاء اسلام کے دور میں اسلامی مبلغین اور مجاہدین نے سر زمین عرب ہی پر کیا منحصر ساری عجم اور افریقہ کی وادیوں کو اپنا حلقہ بگوش کر لیا تھا اس سیاسی وسعت سے جہاں اسلام کی تبلیغ میں سہولتیں پیدا ہوئیں وہیں اسے نئے نئے معاشرتی و تمدنی و اعتقادی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ علماء اسلام کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ان نئے مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا جائے۔ علاوہ ازیں جہاد کی ضرورت آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسلامی حکومتیں قایم ہوگئی تھیں۔ حکومت کی مشینیں آرٹ اور تمدن کے روز افزوں پیدا وار میں کوشاں تھیں۔ لوگ فلسفہ و سائنس یعلم وحکمت کی طرف زیادہ دھیان دینے لگے تھے۔ اس طرح عقلیات نے زور پکڑا۔ کچھ دنوں تک اپنے حالت طفلی میں عقلیات نے مذہب کی اطاعت شعاری پر قناعت کی۔ مگر یہ طفل بے زمام جوان ہوکر مذہب اور احکام شرعیہ سے بغاوت کرنے لگا۔ علم فقہ وعلم کلام کی طرح اسی زمانہ میں ڈالی گئی ہے۔ امام غزالی کو ان کے ذہنی خلفشار کے زمانہ میں یہ علم کسی طور سے بھی راس نہ آیا۔ کیونکہ اِن میں جن مقدمات سے استدلال کیا گیا ہے ان کی بنا تقلید، اجماع یا قرآن وحدیث کے نصوص ہیں۔ ان کا دائرہ عمل بہت ہی محدود ہے پھر بھلا ایک ایسے متشکک دماغ کو اس سے کیا تسکین حاصل ہوسکتی تھی۔ جو بدیہات کے سوا اور کسی چیز کا قائل ہی نہیں۔

فلسفہ

غزالی کا بے چین دل علم کلام کی بے مائیگی سے ناامید ہوکر فلسفہ کی طرف

رجوع ہوا۔ اس سے قبل انہوں نے ایسے متکلمین کی بے حساب تصانیف کا مطالعہ کیا تھا جنہوں نے فلسفہ کے خلاف علی الاعلان جہاد کیا تھا۔ لیکن فلسفہ سے ناواقفیت کے باعث ان کے مضامین میں عامیانہ سطحیت پائی جاتی تھی۔ ان کے مضامین فاش غلطیوں سے پُر تھے۔ امام صاحب نے محسوس کیا کہ فلسفہ کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس فن کا عمیق مطالعہ کیا جائے۔ غرضکہ انہوں نے دو سال کے اندر اس فن میں بھی تبحر حاصل کر لیا۔ اس کا ثبوت ان کی وہ ہردلعزیزی ہے جو فلاسفہ یورپ کے درمیان پائی جاتی ہے۔ (افسوس کہ عجم کے جامد دماغ نے ان کے فلسفیانہ کتابوں کی قدر نہیں کی۔) انہوں نے تمام فلسفیوں کو تین گروہ میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) مادہ پرست۔ (Materialist) یہ لوگ خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا علت و معلول کا ایک حلقہ ہے۔ ہر چیز مادّہ سے پیدا ہوئی ہے۔

(۲) نیچری (Naturalist) یہ گروہ خدا کے وجود کا قایل ہے۔ ایک ایسا خدا جو اس کائنات کے مقصد و اس کے آغاز و انجام کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔ لیکن انکا استدلال یہ ہے کہ چونکہ جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اس لئے قوت تخیّل و ادراک کو بھی فنا ہو جانا چاہیئے۔ اسی لئے وہ روح کی بقا کے منکر ہیں۔ اور قیامت و اس کے لوازمات کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(۳) خدا پرست (Theist) اس گروہ کا سردار سقراط ہے۔ انکے عقیدے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ منطق انکا مسلک ہے۔ امام صاحب نے ابی سینا

وفارابی کا بھی اسی گروہ میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ارسطو کے مرید ہیں۔ جو اگرچہ سقراط و افلاطون سے بہت حیثیتوں میں مختلف ہے مگر کفر والحاد کی صف میں انکے برابر نظر آتا ہے۔

اسی طرح امام صاحب نے علم فلسفہ کو بھی چھ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) علم الحساب۔

(۲) منطق۔

(۳) سیاست۔

(۴) طبعیات (Physics)

(۵) ما فوق الطبعیات (Metaphysics)

(۶) فلسفہ اخلاق (Ethics)

ان میں سے شروع کے چار علوم کو مذہب کی مخالفت سے کوئی بھی سروکار نہیں۔ کیونکہ ان کے اور مذہب کے مقاصد و نیز دائرہ عمل میں زمین آسمان کی دوری پائی جاتی ہے۔ لیکن ما فوق الطبعیات اور اخلاقیات کا علم ایسا ہے جس میں فلسفی کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ارسطو کا فلسفہ اسلام سے قریب ہے مگر اس نے بھی چوبیس غلطیاں کی ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) حشر اجساد کا مسئلہ یعنی یہ کہ قیامت کا عقیدہ صحیح ہے یا نہیں۔ اور اگر بالفرض قیامت ہوتی بھی ہے تو کیا انسان جسمانی حالت میں قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ یا خدا انہیں ایک روحانی شکل عطا کریگا۔

(۲) تقدیر کا مسئلہ۔ وہ کہتے تھے کہ خدا ہر خاص و عام پر نظر نہیں رکھتا ہے

بلکہ اس کے علم میں صرف مخصوص چیزیں ہیں۔

(۳) وہ تمام منفرد چیزوں کو فانی مانتے ہیں جس کے مطابق انسانی افراد کے بقائے نفس کا عقیدہ ختم ہو جاتا ہے۔

(۴) تمام دنیا کے واقعات کو علت و معلول کے سلسلے کا پابند سمجھنا جس سے خرق عادت و معجزہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۵) مادی دنیا اور اس کے حرکت دینے والے عقول کو قدیم ماننا وغیرہ وغیرہ

امام صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام شکوک کا جواب پرزور طریقہ پر دیا۔ انہوں نے ان مسلمان فلسفیوں کا بھی منہ توڑ جواب دیا جنہوں نے یونانی فلسفہ سے استفادہ کر کے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ وہ ایک ایک کو لیکر رد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یونانی فلسفی نہ تو خدا کی ذات کو ثابت کر سکتا ہے۔ اور نہ تو اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ خدا ایک ہے۔ یا کئی ایک یا سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد امام صاحب اپنے خاص رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں جہاں مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ انہیں نظام فلسفہ یونان کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے مگر میانہ روی کی صورت بہتر ہے۔ حقیقت کسی راہ پر پڑی ہوئی ملے اٹھا لینا چاہیئے۔ فلسفہ و سائنس سے قطعاً انحراف کرنا صریحاً جہالت ہے۔ مثلاً سورج۔ چاند و زمین و نباتات و حیوانات کے متعلق سائنس کے جو تجربے ہیں ان سے انکار کرنا سراسر حماقت ہے۔

تصوف ۔ غرضیکہ فلسفہ ان کی ذہنی پیاس کو پوری طور پر نہ بجھا سکا۔ انہیں کسی ایسے مشعل سرمدی کی تلاش تھی جو ان کے قلب کو منور کر دے۔ اس دوران

میں انہیں خدا کی ذات روز جزا اور حال (Inspiration) میں کامل یقین پیدا ہو گیا تھا۔ مگر ان کے دل میں یہ بات اچھی طرح سما گئی تھی کہ محض علم کی خشکی روحانی ارتقا کو پایہ تکمیل تک نہیں پہونچا سکتی۔ بلکہ معراج حقیقت تک پہونچنے کے لئے علم کے بدوش بدوش عمل صالح کی بھی ضرورت ہے۔ اسی جذبہ کے ماتحت انہوں نے اپنی شان و شوکت کی زندگی کو ترک کرکے سیاحت عالم کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان کا دل صوفیوں کے روحانی اوراد و وظائف کی طرف مائل ہو گیا۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ یہی ایک ایسا گروہ ہے جو مذہبی و روحانی حیثیت سے افضل ترین ہے۔

کارتجدید کی نوعیت

عموماً لوگ منصب تجدید کی نوعیت سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ انہیں مجدد اور انقلابی میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔ ایک انقلابی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی بلند پایہ رکھتا ہو۔ اور یہ کہ وہ اسلام کے اصولوں پر عامل بھی ہو۔ لیکن مجدد ہونے کا شرف صرف انہیں کو حاصل ہو سکتا ہے جو اپنے فکر صحیحہ کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق کے بھی مالک ہوں۔ جن کا ظاہر اور باطن اسلام کا آئینہ دار ہو۔ جس کا ظاہر بقول اقبالؒ قاری ہو، باطن قرآن۔ عمل صالح کا پایا جانا پہلی شرط ہے۔ دوسری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک مجدد اسلام اور جاہلیت میں کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتا۔ وہ مسائل پر بے باکانہ تبصرہ کریگا۔ ایسے اپنے جان و مال۔ عزت و آبرو کو اسلام کے نام پر قربان کردینی پڑے گی۔ مجدد نبی نہیں ہوتا اس سے غلطیوں کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔ وہ علوم دینیہ کا امام ہوتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے۔ علوم دینیہ کے ماتحت۔ لیکن اس کا زمانہ قرآن کی طرح ابدی نہیں ہے۔ اس کے اجتہادانہ کارنامے ایک

محدود وقت تک انسانیت کے لئے فلاح وبہبودی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اسی لئے اسلام کے ظہور کے بعد مجدّدین کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا ہے۔ مجدّد مزاج نبوت سے قریب تر ہوتا ہے اور اس میں اعتدال۔ تعصب سے نفرت اور صحیح ذہن پایا جاتا ہے۔ لیکن نبی کے برخلاف مجدّد پر اعتقاد نہ رکھنے سے مذہب کے اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ مجدد اجتہاد فی الدین کرکے اسلامی معاشرت کی گمراہیوں اور بدعتوں کو نکال باہر کرتا ہے۔ تقلید جامد اس کی ضد ہے۔ اس کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے مطابق تہذیب وتمدن کے فرسودہ نظام کو اس طرح رد وبدل کردے کہ اسلامی روح قائم رہے۔ اسلام کو مٹانے والے عناصر کے خلاف جہاد کرے اور وہ اسلامی حکومتوں کو بھی یہ موقع نہ دے کہ وہ جاہلی طرز حکومت پر عمل کرسکیں

مجدّد کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہیہم عالمگیر انقلاب کی کوشش کرتا ہے۔ وہ موجودہ اسلامی حکومتوں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا میں اصلاح وہدایت کی آواز پھیلا دی جائے۔ اور ساری دنیا کے تمدنی نظاموں سے جاہلیت کے عناصر کو نکال کر انہیں اسلامی اصولوں پہلے آنے کی کوشش کی جائے۔ اسلام رسمیات محض کا ایک خوشنما قانون نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے۔ یہ زندہ قوت جب عملی شکل اختیار کرلیتی ہے تو آن کی آن میں اقوام وملل کی تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔

جیسا کہ پیشتر بیان کیا جاچکا ہے کہ امام صاحب نے یونانی فلسفہ کی بری طرح تردید کی ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑی خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ انہوں نے دونوں کو ان کے مقام سے آشنا کردیا۔ فلسفہ مذہب کا ماتحت ہے۔ انہوں

ان متکلمین وعلما دین کی بھی مخالفت کی ہے جو فلسفہ کی تردید میں انتہا تک پہونچ گئے ہیں۔ امام صاحب نے مسلمانوں کے سامنے صحیح عقاید کو پیش کیا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وہ عقاید کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) وہ عقاید جن پر زبان اور دل سے ایمان لانا عین اسلام ہے۔ مثلاً وجود ذات باری تعالیٰ۔ وحدانیت۔ قرآن۔ رسالت۔ قیامت۔ فرشتہ۔ وغیرہ۔

(۲) وہ مسائل جن پر ایمان لانے یا نہ لانے سے اسلامی اعتقاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً قرآن حادث ہے یا قدیم۔ حشر اجساد وغیرہ۔

(۳) وہ مسائل جن پر اعتقاد رکھنا اسلام میں مخالفت کرنا ہے۔ مثلاً بقائے عالم۔ نفی روح۔ وغیرہ۔

لیکن امام صاحب نے سیاسی میدان میں عملی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ ان کے عہد کی اسلامی حکومتوں میں غیر اسلامیت بری طرح غالب آچکی ہے۔ نصاریٰ شام اور اس کے گرد و نواح میں قوت کی تحصیل کے لئے پیہم جنگ آزمائی کر رہے تھے۔ لیکن امام صاحب نے اس کی طرف ذرہ بھی توجہ نہ کی۔ انہوں نے جہاد کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ اور نہ کوئی ان کی طرف سے ایسی ہمہ گیر تحریک اٹھائی گئی جو بعد میں۔ اس خدمت کو انجام دے سکتی لیکن ان کی تصانیف ومجموعہ خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے نظام حکومت پر تبصرہ کیا ہے۔ بادشاہان وقت وان کے سربرآوردہ وزیروں کے پاس انکی طرف سے ذاتی خطوط بھی ارسال کئے گئے تھے۔ جس میں وہ پیہم اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اپنی قلم کے ذریعہ عوام کو یہ احساس دلانا چاہا کہ وہ ظلم وجبر کے آگے

سر تسلیم خم نہ کریں بلکہ انہیں مخلصانہ نکتہ چینی کا حق حاصل ہے۔ وہ بذات خود سلاطین وقت کو بری طرح نفرت کرتے تھے، احیاء العلوم میں ایک جگہ لکھتے ہیں "کہ ہمارے زمانہ میں سلاطین کے تمام یا اکثر مال حرام ہیں"۔ درباروں سے احتراز اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ساری عمر اپنے قول پر ڈٹے رہے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نصاریٰ مسلمانوں کے سروں پر پہونچ چکے ہیں مگر مسلمان بادشاہ اپنے عیش و عشرت میں مشغول ہیں۔ دوسرے یہ کہ بیچاری رعایا پر مختلف قسم کے غیر شرعی ٹکس لگا دیئے گئے تھے جن سے ان کی حالت تباہ ہو رہی تھی۔ اس صورت میں امام صاحب کی اسلامی غیرت کب گوارا کر سکتی تھی کہ وہ شاہان وقت کے خزانوں سے متمتع ہوں اور رعایا ان کے آسیائے ظلم و جبر میں پستی رہی۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں" ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیئے اور نہ ان کی صورت دیکھنی چاہیئے! انسان کے لئے لازم ہے کہ ان کے ظلم سے بغض رکھے اور ان کے بقا کو پسند نہ کرے۔ ان کی تعریف نہ کرے۔ ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ ان کے رسائی رکھنے والوں سے دور رہے"۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک شاگرد عبداللہ نے ان کے کہنے کے مطابق اسپین میں موحدین کی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو یہ کہنا پڑیگا کہ امام صاحب کی سیاسی خدمات بہت ہی ضمنی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ امام صاحب نے درس و تدریس وعلم و ادب سے کبھی قدم آگے نہیں رکھا۔ وہ ایک فاضل عرفان شناس اور بزرگ صوفی تھے۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے اپنی تصانیف کا بیش بہا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ وہ جس فلسفہ کے طلسم کو توڑنے

(بقیہ صفحہ ۲۱۳ پر)

(۱)

مختصر سیرۃ محمدؒ بن عبدالوہاب

(از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

یوں تو بنوامیہ کے دورِ حکومت ہی میں حجاز کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ دمشق کے شاطروں نے حرمین کو پیرزادوں کی خانقاہ بنا دیا اور پھر ابو مسلم خراسانی کی تلوار نے عربوں کی سیاسی قسمت ہی کا فیصلہ کر دیا۔ (۱۳۲ھ) معتصم (۲۱۸ھ ۸۳۳ء ـ ۲۲۷ھ ۸۴۲ء) کے دور میں ترکوں نے زور پکڑا، اور پھر تخت و تاج نے ان کے قدم لئے مسلمانوں کے عروج کی ان صدیوں میں بغداد اور قرطبہ کی علمی درس گاہیں قائم ہوئیں، ازہر، زیتونہ (تونس) اور قرویین (فاس) کی مسجدوں سے علم و عمل کے چشمے جاری ہوئے۔ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ سلیمان اعظم نے وائنا کی دیوار ہلا دی۔ مغلوں نے ہندوستان کو زیر و زبر کیا........ لیکن عرب کا شتربان اپنے صحرا میں آرام کی نیند سوتا رہا۔ عثمانی سلاطین نے حجاز پر صدیوں حکمرانی کی، لاکھوں کروروں کے چڑھاوے دئے۔ مجاوروں اور متولیوں کے لئے بیش قرار وظیفے مقرر کئے...... پر عرب کے ریگستان میں کہیں علم کا چشمہ جاری نہ ہوا! اور عرب کا بادیہ نشین ایام جاہلیت

کے نوتہ پر لوٹ کھسوٹ کی زندگی بسر کرتا رہا۔ (۲)

محمد بن عبدالوہاب

بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہوگئی، مسلمان کتاب وسنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے، ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنالیے گئے اور معبود حقیقی کی درگاہ کو چھوڑ کر، مسلمان ہر شجر وحجر کے آگے جھکنے لگے —— جب یہ حالت ہوگئی تو پھر اسی بے آب وگیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیہ وہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا، ارضِ خاک عرب کے وہ ذرے جو جہل وشرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اٹھے، اور نجد کی وادی سے توحید وصراط مستقیم کی ایسی خوشبو پھیلی۔ جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا کر چھوڑا، میری مراد بارہویں صدی ہجری کے مجدد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے ہے۔ جنھوں نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے مسلمانوں کو توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور جہاں تک ان کی آواز پہنچ سکتی تھی انہوں نے تبلیغ کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔

ابن عبدالوہاب کی پیدائش کے وقت دنیائے اسلام کی حالت

یوں تو اسلامی دنیا کا فکری زوال آٹھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا، اجتہاد ونظر کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے لیکن بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا۔ کہ غیر مسلم بھی عہد صحابہ کے حالات سے اس دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے تو انھیں تعجب وافسوس ہوتا۔ آئیے، ہم آپ کو ایک امریکن غیر مسلم مبصر (Lathrop Stoddard) کے موئے قلم کا تیار کردہ نقشہ دکھائیں چشم عبرت وا کیجئے اور دیکھئے، اس آئینہ میں مسلمانوں کے جو خط وخال نظر آتے ہیں وہ آج بھی بڑی حد تک صحیح ہیں یا نہیں؟ امیر شکیب ارسلان کی رائے میں بڑے

سے بڑا دقیق النظر عالم بھی بارہویں صدی ہجری کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر نہیں کھینچ سکتا۔[1]

" مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوف کے طفلانہ توہمات
" کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا مسجدیں ویران
" وسنسان پڑی تھیں، عوام جہال ان سے بھاگتے تھے۔ اور تعویذ گنڈے
" اور مالا میں پھنس کر گندے فقرا اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد
" رکھتے تھے، اور بزرگوں کے مزارات پر زیارت کو جاتے تھے، اور انکی
" پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی، کیونکہ
" ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی طاعات
" بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پس پشت ڈال
" دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔ افیون اور شراب
" خواری عام ہو رہی تھی، زناکاری کا بازار گرم تھا۔ اور ذلیل ترین
" اعمال کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ مقامات
" مقدسہ (مکہ و مدینہ) بداعمالیوں کے مرکز بن گئے تھے، اور حج جس کو
" رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرائض میں تعلیم کیا تھا، بدعات کی
" وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے
" روح رسمیات اور مبتذل وہم پرستیوں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اگر محمد (صلی اللہ
" علیہ وسلم) پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروں کے ارتداد اور بت پرستی

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد اول صفحہ ۲۶ (حاشیہ)

پربیزاری کا اظہار فرماتے ہیں:

(جدید دنیائے اسلام (The New World of Islam) پہلا باب)

نجد ابن عبدالوہاب سے پہلے | بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا جو حال تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ سٹاڈرڈ کے بیان سے ہوا ہوگا۔ لیکن جزیرۃ العرب کے قلب (نجد) کی حالت اور بھی خراب تھی۔ اخلاقی خرابیوں میں اہل نجد حد سے گذر چکے تھے، اور بھلائی برائی کا کوئی معیار قائم نہیں رہا تھا۔ مشرکانہ عقائد صدیوں کے تسلسل سے اس طرح دلوں میں گھر کر چکے تھے، کہ ایک بڑا طبقہ انھیں خرافات کو "دین صحیح" کا نمونہ جاننے لگا تھا۔

جُبَیلہ (وادی حنیفہ) میں زید بن خطاب کی قبر کی پرستش ہوتی تھی، درعیہ میں بھی بعض صحابہ کے نام سے منسوب قبریں اور قبے عوام کی جاہلانہ عقیدت کے مرکز ہو گئے تھے، وادی غبیرہ میں فرار بن ازور کا قبہ بدعتوں کی نمائش گاہ ہو رہا تھا، اور سب سے بڑھکر یہ کہ بلیدۃ الفدا میں ایک پرانے درخت کے ساتھ جوان مرد اور عورتیں جو سلوک کرتی تھیں، ان کے بیان سے زبان قلم عاجز ہے۔ خلاصہ یہ کہ مایوس عورتیں اولاد کی تمنا میں اس درخت سے ہم کنار ہوتیں۔ درعیہ کے پاس ایک غار تھا۔ جہاں حد درجہ شرم ناک برائیاں ہوتی تھیں الخ الخ۔

یہ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا، علم یا تو تھا نہیں اور جو دو چار فقہ و حدیث سے بہرہ ور تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اپنے میں ہمت نہیں پاتے تھے، آخر علماء نجد دنیا کے علماء سے الگ تو تھے نہیں!!

سیاسی حالت اور بھی خراب تھی۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی یہ شمالی

نجد (جبل شمر) میں قبیلہ طے اور حسا میں بنو خالد کا زور تھا۔ عینیہ بنو تمیم کا مرکز تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عینیہ کی امارت حسا کے بنو خالد کا اقتدار مانتی تھی، درعیہ میں قبیلہ عنیزہ کے قدم جم رہے تھے، درعیہ سے قریب منفوحہ میں دواس کی الگ امارت قائم ہو گئی تھی۔

نشو ونما

نجد کا چھوٹا سا علاقہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، اس پر آشوب دور اور نا موافق ماحول میں محمد بن عبد الوہاب نے آنکھیں کھولیں، عینیہ[۱] کے ایک علمی گھرانے[۲] میں پیدا ہوئے (۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء) اور اپنے والد ماجد شیخ عبد الوہاب قاضی عینیہ کے آغوش میں تربیت پائی۔

محمد بن عبد الوہاب آغاز طفولیت ہی سے ذہانت اور قوت حافظہ میں ممتاز تھے دس برس کی عمر سے پہلے قرآن مجید کے حفظ سے فارغ ہو گئے، اپنے والد سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث و تفسیر کی کتابیں بہ کثرت مطالعہ کیں ان کے والد عبد الوہاب، ان کی اس ذہانت اور استعداد علم سے متعجب ہوتے، انکا بیان ہے کہ محمد کی تدریس کے دوران میں وہ خود بھی اپنے ہونہار بچے کی ذہانت اور وسعت معلومات سے مستفید ہوئے، شیخ عبد الوہاب اپنے بیٹے کے علم سے اس قدر متاثر تھے کہ نوعمری کے باوجود وہ انھیں امامت کے لئے آگے بڑھاتے، کم سنی ہی میں شادی ہوئی، اور فریضہ حج سے مشرف ہوئے، مدینہ منورہ میں دو ماہ قیام کے بعد عینیہ[۳] واپس ہوئے اور اپنے والد ماجد سے تحصیل علم میں معروف ہو گئے، یادداشتیں

[۱و۲]: حاشیہ صفحہ ۷ پر۔
[۳]:۔ عینیہ، عین (چشمہ) کی تصغیر ہے، پہلے اس مقام پر کوئی چشمہ تھا، اب اسے شیخ الاسلام کی نسبت سے بلد الشیخ بھی کہتے ہیں۔

اور علمی کتابیں نقل کرتے۔ اتنی محویت ہوتی کہ ایک ایک نشست میں بیس بیس صفحے لکھ جاتے۔

علم کی راہ میں محمد بن عبدالوہاب فطرت کی طرف سے ایک حساس دل لے کر آئے تھے، اپنے اردگرد نجد کے شہروں اور بستیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر وہ کبیدہ خاطر ہوتے عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا۔ خود اہل علم کی حالت ناگفتہ بہ تھی، محمد اپنے باپ (عبدالوہاب) سے (جو نجد کے علما میں ممتاز تھے) جو کچھ حاصل کر سکتے تھے، اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن ہونے والے مصلح کی پیاس دو چلو پانی سے کس طرح بجھ سکتی تھی! حج سے مشرف ہو چکے تھے، حجاز کی مرکزیت دل میں گھر کر چکی تھی، طلب علم کا خیال آتے ہی حجاز کا ارادہ ہوا، پُرجوش نوجوان کی عمر کوئی بیس برس ہوگی، کہ لیلائے علم کے شوق میں اس نے دشت نوردی کی ٹھانی اور حجاز کا رخ کیا۔ دوبارہ حج بیت اللہ اور مسجد نبوی کی زیارت سے مشرف ہو کر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل علم میں منہمک ہو گئے۔ خاص طور پر شیخ عبداللہ بن ابراہیم کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور ان کی وساطت سے شیخ محمد حیات سندھی (م ۱۱۶۳ھ) کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوا، شام کے مشہور عالم شیخ علی داغستانی (م ۱۱۹۹ھ) نزیل مدینہ سے بھی روایت کی۔

مدینہ منورہ سے شیخ نے بصرہ کا قصد کیا اور وہاں متعدد علماء سے حدیث اور لغت کا درس لیا۔ شیخ محمد مجموعی کے درس میں خاص طور پر حاضر ہوتے رہے، شام

لہ :۔ محمد بن عبدالوہاب کے والد شیخ عبدالوہاب اور دادا شیخ سلیمان بن علی بن مشرف اور دوسرے اہل خاندان کے حالات السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ میں مذکور ہیں۔

کا بھی ارادہ رکھتے تھے، لیکن زاد راہ کی کمی کے باعث کامیاب نہ ہوئے، اور احسار ہو کر حریملا (نجد) کو لوٹ آئے، جہاں ان کے والد ۱۱۳۹ھ میں منتقل ہو گئے تھے۔

دعوت و تبلیغ ابن عبدالوہاب بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف مائل تھے، ابھی عیینہ میں فقہ و حدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے، کہ بدعات انکی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور جہاں کوئی عمل اصول دین کے خلاف پاتے، فوراً نہی عن المنکر کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے۔

مدینہ منورہ میں محمد حیات سندھی اور علی داغستانی سے استفادہ کے بعد حدیث پر نظر ہوئی، اور پھر چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھی، تو انھیں دنیا گمراہی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی، جہاں تک پتہ چلتا ہے، شیخ نے سب سے پہلے اسی زمانہ میں استغاثہ، کے خلاف آواز اٹھائی، رسول کریم (ص) کی قبر اطہر کے پاس جاہلوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔

بصرہ میں یہ جذبہ تیز ہو گیا۔ نہی عن المنکر بلا خوف و خطر کرتے، جس کے پاداش میں انھیں قسم قسم کی تکلیفیں سہنا پڑیں اور آخر انھیں بصرہ چھوڑنا پڑا۔ یہی نہیں، بلکہ ان سے تعلق اور ہمدردی کے جرم میں، شیخ مجموعی کو بھی ستایا گیا۔ بصرہ سے بھاگے ہوئے سخت گرمیوں میں بڑی مصیبتوں سے زبیر[۱] اس حال میں پہنچے، کہ پیاس کے سبب سے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، آخر ایک با خدا انسان ابو حمیدان نامی نے دستگیری کی، اور ان کی پیاس بجھائی۔

---

۱ :- زبیر۔ بصرہ سے قریب ایک قصبہ ہے، جو حواری رسول حضرت زبیرؓ بن عوام کے نام پر آباد ہے اس وقت بھی اس کے باشندے اتباع سنت میں ممتاز ہیں۔

یہ سب دعوت کی ابتدائی منزلیں اور تمہیدی کام تھے، حریملا واپسی کے بعد انہوں نے بدعات کے استیصال اور توحید و اخلاق کے عام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی اور عبادت، کسی قسم کی ہو، صرف اللہ تعالٰے کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا کلمہ لا الٰہ کا بول بالا ان کا شعار تھا صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں جاہلوں کے عقائد کی اصلاح اور انھیں معبودان باطل، قبہ و قبر سے ہٹا کر پھر معبود حقیقی کے درگاہ میں لاکھڑا کرنا ان کا مقصود تھا، پھر یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے ایمان خالص اور سچی عزیمت کی ضرورت تھی، اس راہ میں شیخ کو جن صبر آزما تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا اور جس خندہ پیشانی کے ساتھ انھوں نے مصائب کا استقبال کیا، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ ان اوصاف سے پوری طرح متصف تھے۔

توحید کی دعوت دی، غیر اللہ کے آگے جھکنے، قبروں، ولیوں، سے مدد مانگنے، نیکوکار بندوں کو معبود ثانی بنانے سے روکنے کی کوشش کی، قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں، ان کے مٹانے کو عملی قدم اٹھایا، بس پھر کیا تھا۔ مخالفت کا سیلاب امنڈ آیا، اعزا، اقربا، درپے آزار ہو گئے، خود باپ کو بھی یہ ادا نہ پسند آئی، شیخ نے باپ کا ادب اور استاذ کی عزت کا پورا لحاظ رکھا، لیکن جو قدم آگے بڑھ چکا تھا وہ پیچھے نہ ہٹا، ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی، پر صبر و عزیمت کا کوہ وقار اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا تمام رکاوٹوں کے باوجود انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا، اور عارض[1] کے تمام قصبات حریملا، عیینہ، درعیہ، ریاض وغیرہ میں ان کی

---

[1] :۔ عارض:۔ ایک پہاڑی کا نام ہے، اسے جبل یمامہ بھی کہتے ہیں اور اس کے گرد و نواح کی زمین

(بقیہ صفحہ ۲۰۱ پر)

رت پھیل گئی اور تعلیمات کی اشاعت ہونے لگی۔

تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا، لیکن والدِ ماجد کی مخالفت کے باعث رفتار سست ا، ۱۱۵۳ھ میں والد کا انتقال ہوا، تو پھر دعوت و تبلیغ میں گرمی پیدا ہوگئی، علی الاعلان باع سنت اور ترک بدعات کا وعظ کہنے لگے۔ حریملا کے کچھ لوگ متأثر ہوئے اور یک کے پرجوش معاون ہوگئے، شیخ کے درس میں حاضر ہونے لگے اور ان کے مواعظ ے مستفید ہوئے۔

شیخ کی مشہور تصنیف کتاب التوحید اسی دوران میں تالیف ہوئی۔

عیینہ میں | دعوت و تبلیغ کی ابتدائی منزلیں طے کرنے پر شیخ کو احساس ہوا کہ اس فراتفری میں کہ ہر ناحیہ[1] کا حاکم الگ ہے، کامیابی دشوار ہے، خود حریملا میں دو خاندان سرداری کے لئے دست بہ گریبان تھے، ان حالات میں کوئی موثر قدم اٹھانا مشکل تھا، انھوں نے پورے نجد کو ایک حاکم کی امارت اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنیکا ارادہ کرلیا، وہ سمجھتے تھے کہ کسی امیر (حاکم یا صاحب نفوذ و قوت) کی ہمدردی حاصل کئے بغیر دعوت کو دور و نزدیک جلد از جلد پھیلانا آسان نہیں، ان خیالات کے پیش نظر انھوں نے عثمان بن حمد بن معمر، امیر عیینہ سے خط وکتابت کی، امیر کو قبول حق پر آمادہ

(بقیہ صفحہ ۲۰۰ کا) وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے، یہ قصبات اسی وادی میں واقع ہیں جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں، آلوسی نے تاریخ نجد (ص ۶ - ۲۶) میں بلاد نجد کا مفصل جغرافیہ دیا ہے، مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ نجد کے تین بڑے حصے ہیں (۱) شمالی مغربی حصہ، جس کا نام شمر ہے اسکے مشہور شہر حائل اور النقرہ ہیں (۲) شمالی مشرقی حصہ جس کا نام القصیم ہے اسکے مشہور شہر عنیزہ اور بریدہ ہیں (۳) جنوبی حصہ جو العارض کہلاتا ہے اسکا مشہور شہر ریاض ہے، جو آج حکومت سعودیہ کا پایۂ تخت ہے،

---

[1] ۔ عثمانی حکومت کے دور میں ملک کی تقسیم، انتظامی سہولت کے لحاظ سے ان چار حصوں میں کی جاتی تھی۔ ولایۃ (صوبہ)، لواء (کمشنری)، قضاء (ضلع)، ناحیۃ (تحصیل یا سب ڈویژن) عارض کا شمار ناحیہ میں تھا۔

پاکر وہ خود بھی عینیہ منتقل ہو گئے، امیر نے اچھی طرح آؤ بھگت کی اور شیخ کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔

عثمان کی امداد کے سہارے شیخ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کھلم کھلا دعوت دینا شروع کی، اس علاقہ میں بعض درختوں کی توقیر کی جاتی تھی، انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا، زید بن خطاب کے نام سے ایک قبر تھی اور اس پر قبہ، اس کا بھی خاتمہ کیا، امیر ابن معمر کو نماز باجماعت کے احیاء کی تاکید کی، اور متخلفین کے لئے سزائیں تجویز ہوئیں۔ حکام قسم قسم کے ٹیکس وصول کرتے تھے، شیخ نے تمام ٹیکس اڑا دیے اور صرف زکوۃ وصول کرنے پر آمادہ کیا اور شرعی حدود کا نفاذ بھی شروع ہو گیا۔ شیخ نے ابن معمر کے ہاتھ سے یہ دو کام اچھے کرائے، اس پر بھی ان کے دشمن طرح طرح کے الزامات دیتے تھے۔

درعیہ میں ۱۱۵۷ھ عینیہ میں کامیابی قدم لینے کو تھی اور اصلاح کی مہم مکمل ہوتی جا رہی تھی کہ قدرت نے ایک شر پیدا کیا، جس میں ہزاروں برکتیں پنہاں تھیں۔ احساء کے حاکم اور اس کے حواریین کو یہ تبدیلیاں بری لگیں، اس نے ابن معمر کو کہلا بھیجا۔

"اس فقیہ کو قتل کر دو، ورنہ تمہارا سالانہ خراج ہم بند کئے دیتے ہیں" خراج کی مقدار ۱۲۰۰ دینار تھی، عثمان میں نہ حاکم احساء سے لڑنے کی طاقت تھی، نہ شیخ کو اپنے گھر میں تہ تیغ کرنے کی جرأت، اس نے شیخ کو اطلاع دی کہ ہم سلیمان حاکم احساء سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتے" شیخ نے کہا:۔

"اگر تم میری پشت پناہی کرتے ہو، تو سارا نجد تمہارے قدموں کے نیچے ہے"

اس پر بھی عثمان تیار نہ ہوا اور شیخ کو عثمان کے ایک سپاہی کی ہمراہی میں، اس کے حدود اقتدار سے باہر چلا جانا پڑا۔ ابن معمر کے حدود اقتدار سے نکل کر شیخ نے درعیہ میں

پناہ لی، جہاں امیر محمد بن سعود کی ریاست تھی جو ابن عبدالوہاب کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے سے پہلے بھی حسن اخلاق میں مشہور تھا، ایک خوش بخت انسان عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن سویلم کے گھر مہمان ہوئے، بیچارہ عربی اخلاق سے مجبور ہو کر کچھ نہ بولا، پر امیر کے خوف سے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ شیخ نے نصیحت کی اور تسکین دی اور امیر کی رضا مندی کی امید دلائی۔

محمد بن سعود کی معاونت ابن سویلم کے گھر ٹھہرے، تو وہ دعوت توحید کا مرکز بن گیا۔ لوگ چھپ چھپ کر آنے لگے، اہل علم خاص طور پر مستفید ہوتے، لیکن یہ صورت قابل اطمینان نہ تھی۔ شیخ نے امیر سے سلسلہ جنبانی کرنا چاہی، اور امیر کے بیٹے مشاری اور ثنیان سے گفتگو کی، انہوں نے پہلے امیر کی بیوی موضی بنت ابی وحطان سے، جو نہایت ذی فہم اور متدین عورت تھی، شیخ کے علم و فضل کی تعریف کی اور اسے امیر سے سلسلہ جنبانی پر آمادہ کیا۔ قدرت کو یونہی کرنا تھا، راہ بھی نکل گئی موضی کے دل میں خود بخود شیخ کی ہیبت بیٹھ گئی، اس نے امیر سے عرض کی:۔

"اللہ نے یہ نعمت تمہارے ہاں بھیج دی ہے، اس کی مدد کرو، تمہاری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی"

امیر محمد بن سعود کے دل میں بھی شیخ کی محبت اتر گئی، اور سب کے مشورہ سے شیخ سے ملنے میں اس نے خود پہل کی اور اخلاق و عقیدت سے پذیرائی کی۔ شیخ نے جواب میں اپنی دعوت کے اہم حصوں (کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد) پر مختصر سی تقریر کی اور اہل نجد کی برائیوں سے آگاہ کیا اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔

امیر متاثر ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا:۔

" اے شیخ! یہ تو بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین
" ہے، میں آپ کی امداد اور مخالفین سے جہاد کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میری دو شرطیں
" ہیں: (۱) اگر ہم نے آپ کی امداد کی اللہ نے ہمیں فتح دی، تو آپ ہمارا ساتھ نہ
" چھوڑیں (۲) اہل درعیہ سے فصل کے وقت خراج لیتا ہوں۔ آپ مجھے اس سے
" نہ روکیں "

شیخ نے جواب دیا۔

" پہلی شرط بسر و چشم منظور ہے (الدم بالدم والھدم بالھدم: میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے)، رہی دوسری شرط، سو انشا اللہ، تمہیں فتوحات میں اتنی غنیمتیں ملیں گی کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہیں آئے گا "

امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا، جہاد اور کتاب و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ۱۱۵۷ھ کا ذکر ہے، امیر کا بیعت کرنا تھا کہ جوق جوق لوگ استفادہ اور تجدید ایمان و اعمال کے لئے آنے لگے، عینیہ کے پرانے فیض یافتہ اور ہم نشیں، جن کے دلوں میں شیخ کی دعوت گھر کر چکی تھی درعیہ آ گئے، ان آنے والوں میں خود عثمان بن معمر رئیس عینیہ کے بعض عزیز بھی تھے۔

ابن معمر کی زود پشیمانی دعوت کی روز افزوں عمومیت اور مقبولیت کی خبر پا کر ابن معمر سے نہ رہا گیا، اسے اپنے سابق طرز عمل پر بڑی پشیمانی ہوئی اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی ساتھ ساتھ عینیہ واپس چلنے کی درخواست بھی کی شیخ نے جواب میں صاف کہا۔

" اب یہ امیر محمد بن سعود کے اختیار میں ہے، ان کی اجازت ہو، تو تیار ہوں،

ورنہ" انھیں چھوڑ کر کسی دوسرے کی رفاقت اب منظور نہیں ؎۔

یہ واضح جواب پاکر ابن معمر نے خود میزبان امیر ابن سعود سے اجازت طلب کی، لیکن وہ اس نعمت کو اپنے گھر سے کسی دام پر الگ کرنے کو تیار نہ تھے۔

۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء کے بعد دور عمل شیخ کی تشریف آوری سے پہلے درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں جہالت کی گرم بازاری تھی۔ شیخ نے سب سے پہلے درس و وعظ کے حلقے قائم کئے اور خود صبح سے شام تک آنے والوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے، اور اپنی دعوت، دعوتِ توحید واخلاص فی عبادۃ اللہ، کے اہم اجزاء ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ شیخ کی جاذب شخصیت اور دعوت کی سچائی نے فوری اثر دکھایا۔ مجالس وعظ و تذکیر سے یہ فائدہ پہنچا، کہ دلوں سے "ما الفینا علیہ آباءنا" کا زنگ دور ہونے لگا اور رسم و رواج کی خرافات کو وہ صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔

ان مجالس کی کشش دور دور سے تشنگان علم کو درعیہ لے آئی، کبھی کبھی شاگردوں اور عقیدت مندوں کی زیادتی اور ان کی میزبانی کے باعث شیخ کو مقروض ہونا پڑا، پر دعوت میں روز بہ روز ترقی ہوتی رہی، اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

دعوت کی وسعت اہل درعیہ تو شیخ کے آتے ہی عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے، لیکن وہ اس پر قانع نہ تھے۔ نجد کے مختلف علاقوں اور ان کے سرداروں کو ترغیب دیتے۔

یمن اور شام تک دعوت پہنچانے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ آہستہ آہستہ ثمرات نمودار ہونے لگے ۱۱۵۸ھ میں امیر عیینہ نے درعیہ آکر بیعت کی اور حدود شرعیہ کے

نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اہل حریملا نے بھی بیعت کی۔ ادھر امیر محمد بن سعود کی معاونت کا یہ عالم تھا، کہ خمس اور زکاۃ کی تمام رقمیں شیخ کے ہاتھ میں دی جاتیں

اور وہ انھیں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے، امیر ابن سعود اور ان کے بیٹے امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود۔ جو ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵ء) میں اپنے والد کی وفات کے بعد جانشین ہوئے ـــ شیخ کی اجازت کے بغیر ادنیٰ تصرف روا نہیں رکھتے۔ با ایں ہمہ شیخ کی للہیت کا یہ عالم تھا، کہ اپنے پاس ایک حبہ نہ رکھتے، اور جو کچھ آتا، سب اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔

ابن دواس اور دوسرے مخالف

درعیہ کی اقامت کے تیسرے سال (۱۱۵۹ھ) دھام بن دواس حاکم ریاض کی زیادتیوں نے شیخ اور امیر کو اپنی طرف متوجہ کیا، ریاض اور منفوحہ کے موحدین کو اس نے محض اتباع شیخ کے جرم میں سزائیں دیں۔ مجبوراً امیر محمد بن سعود کو جنگ کرنا پڑی، جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور آخر چھبیس تیس سال کی مسلسل چھیڑ چھاڑ کے بعد ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) میں ریاض پر امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود کا قبضہ ہوا۔

اسی دوران میں آس پاس کی دوسری طاقتیں بھی حملہ آور ہوئیں، عثمان بن معمر نے بار بار دھوکا دیا۔ اہل نجد اور شیخ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر مخالفوں نے اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کئے، سلیمان بن محمد بن سحیم نے شیخ پر بہتان طرازیاں کیں اور ان کی طرف رنگ برنگ کی برائیاں منسوب کیں۔ دوسری جانب چھوٹے چھوٹے علاقوں کے رئیس، اپنی خود مختاری کے بچاؤ کی خاطر، ان افترا پردازوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔

پر ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، اور مطوع[1] درعیہ سے

---

[1]: نجد کی زبان میں معلم و مبلغ کو مطوع کہتے ہیں، مطاوعہ جمع کا صیغہ بکثرت آتا ہے، موحدین کی نئی برادری اخوان میں بھی مبلغین کی جماعت مطاوعہ کہلاتی ہے۔

نکل کر نجد کے تمام علاقوں میں پھیل گئے، تاآنکہ کم از کم قلب جزیرہ میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہو گئیں۔

وفات | شیخ نے پچاس ساٹھ سال مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۲ء) میں رحلت کی۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز، عجیب پاک باز ہستی تھی۔ کم لوگوں کو زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔

اولاد و احفاد کا ایک سلسلہ بلکہ سلسلۃ الذہب ہے جو اب تک جاری اور خدمت دین و علم میں مصروف ہے، جس طرح شیخ کی جائے سکونت و ولادت عیینہ بلد الشیخ کے نام سے مشہور ہے، اسی طرح ان کی اولاد آل الشیخ کہلاتی ہے اور یہی ان کا نسب ہے۔

(۳)

سیاسی برتری | شیخ کی دعوت کے ساتھ ساتھ آل سعود کا نام بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم اجمالی طور پر آل سعود کی تاریخ کے ان اہم حصوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں جن کا اس تحریک سے خاص اور بلاواسطہ تعلق ہے، شیخ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجد اور اطراف نجد میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں، وہ سب نتیجہ تھیں، شیخ الاسلام کی دعوت اور ان کے اخلاص کا، حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے اہل نجد کی زندگی عقائد۔ اخلاق میں ایک غیر معمولی اصلاح نہیں، بلکہ کایا پلٹ کر دی خوش قسمتی سے شیخ کو محمد بن سعود (م ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۶ء) عبد العزیز بن محمد سعود (۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۶ء - ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) اور سعود بن عبد العزیز (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرماں روا ملے، جنہوں نے شیخ کے کام کی تکمیل میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور یہ انھیں کی مسیحا نفسی کا کرشمہ ہے، کہ آج بھی نجد کی دینی حالت دوسرے

مسلم علاقوں سے ہزار گونہ بہتر ہے، اور کم از کم یہ دنیا کا ایک ایسا خطہ ہے، جہاں
شرعی حدود بے کم و کاست نافذ ہوتے ہیں۔

محمد بن سعود

(۱) امیر محمد بن سعود (— م ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۶ء) نے دعوت کے پھولتے پھلتے ہی حرمین کو ایک وفد بھیجا، جس نے شریف مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ / ۱۷۳۳ء - ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) سے حج کی عام اجازت طلب کی اور علمائے حرمین سے مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کی۔ "مفتیان حرم" کا رویہ افسوس ناک رہا اور ان کے فتوی کے بموجب وفد کے ارکین گرفتار کرلئے گئے، بعضوں نے مشکل سے اپنی جان چھڑائی، شریف مسعود کے اس رویہ کے بعد پھر اس کے دور میں امیر بن سعود نے زیارت حرمین کی کوشش نہیں کی۔

عبدالعزیز بن محمد بن سعود

(ب) مساعد کے بعد اس کا دوسرا بھائی احمد بن سعید والی مقرر ہوا، (۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء) تو امیر درعیہ نے علماء کا ایک وفد بھیجا، جس نے علماء مکہ سے گفتگو اور انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے بھی حج کی اجازت نہ دی، اس وفد کے سرگروہ نجد کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز الحصین تھے، ان کے ساتھ امیر نجد نے ہدیے اور تحفے بھیجے تھے، نیز خود شیخ الاسلام نے دست خاص سے لکھ کر ایک خط دیا تھا، جس میں اپنی دعوت کی توضیح کی تھی۔

(ج) ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں سرور بن مساعد نے مکہ مکرمہ کی گورنری حاصل کی، تو پھر اہل نجد نے سلسلہ جنبانی کی، اس نے اذن حج کے معاوضہ میں اہل ایران کی طرح ان سے بھی نذرانہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن موحدین نے رشوت دے کر حج کرنا قبول نہ کیا۔

(د) سرور بن مساعد کی وفات (۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء) کے بعد اس کا بھائی غالب شریف مکہ

مقرر ہوا، تو اس نے ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) میں، یعنی شیخ کی وفات سے دو برس پہلے عبدالعزیز بن سعود سے دریافت حال کے لئے ایک نجدی عالم کی فرمائش کی، جو شیخ کی دعوت سے پوری طرح باخبر ہو۔ امیر ابن سعود نے قاضی عبدالعزیز بن عبداللہ الحصین کو شیخ کا خط دے کر روانہ کیا، شریف غالب قبول دعوت پر مائل تھا، لیکن فقہاء نے منع کیا اور نجدی اقتدار کے ہوّے نے اسے قبول حق سے باز رکھا، جس کا خمیازہ تمام دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا۔

(ہ) ۱۲۱۱ھ میں شریف غالب والی مکہ مکرمہ نے امیر عبدالعزیز سے پھر ایک نجدی عالم کی فرمائش کی، جو حرم شریف کے عالموں سے مختلف فیہ مسئلوں پر دو باتیں کر سکے، عبدالعزیز نے شیخ احمد بن ناصر بن عثمان حنبلی کو ایک جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ فریقین میں خوب خوب مناظرہ ہوا، حرم کے عالموں کی طرف سے عبدالملک حنفی پیش پیش تھے، وعظ و بحث کی یہ مجلسیں رجب ۱۲۱۱ھ (جنوری ۱۷۹۷ء) میں منعقد ہوئی تھیں، شیخ احمد بن ناصر کے جوابات ایک رسالہ کی صورت میں چھپ گئے ہیں۔

(و) یوم شنبہ ۸ محرم الحرام ۱۲۱۸ھ (اپریل ۱۸۰۳ء) کو سعود بن عبدالعزیز مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوا، تو بقول ایک پادری (**Hughes**) کے

"حرم کی تقدیس کے باعث باشندوں کو اذیت اگرچہ نہیں پہنچا اور اہل نجد
کے صاحب امر ہونے کے بعد مسجدیں اس طرح آباد اور معمور ہوئیں کہ عہد نبوت کے بعد
بلاد اسلامیہ میں طاعت و زہد کی یہ مثال پھر دیکھنے میں نہیں آئی۔"

(ڈکشنری آف اسلام صفحہ ۶۲۰)

(ز) عبدالعزیز بن محمد بن سعود ایک ایرانی شیعہ کے ہاتھ، عصر کی نماز پڑھتے ہوئے

شہید کئے گئے، (۱۸ رجب ۱۲۱۸ھ = ۴ نومبر ۱۸۰۳ء) اس وقت عبدالعزیز کی عمر ۷۰ سال

کی تھی، جو یکسر جہاد و خدمت میں بسر ہوئی۔

سعود بن عبدالعزیز | (ح) سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) کے دور میں

مصریوں اور ترکوں سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا[1] اور اس دوران میں بڑے

بڑے معرکے ہوئے اور افسوس ناک واقعات پیش آئے اس سلسلہ میں نجدی اور مصری

فوجوں کا باہمی فرق اور طرز عمل معلوم کرنے کے لئے ایک مصری مورخ کا بیان نقل کرنا

نامناسب نہ ہوگا۔

جبرتی ۱۲۲۷ھ کے حوادث کے ضمن میں مصری نجدی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے،

ایک مصری فوجی افسر کا بیان نقل کرتا ہے۔

ہمیں فتح کیسے نصیب ہو؟ ہماری فوج کا بڑا حصہ بے دین ہے کسی آئین کی پابندی

نہیں۔ بکس کے بکس مسکرات سے بھرے ہوئے ساتھ ہیں۔ ہماری چھاؤنی میں

اذان سنائی نہیں دیتی نہ فرائض کی پابندی ہے؟ ان کے دلوں میں دین

اور شعائر دین کا خیال بھی نہیں آتا۔

---

[1]: یہ لڑائیاں زیادہ تر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء سے ۱۲۳۴ھ تک ہوئیں، اشراف مکہ نے پہلے طرح دی، پھر لڑائی چھڑ گئی، آستانہ سے کمک آتی رہی، درمیان میں صلح بھی ہوئی اور نجد سے علماء کے وفود بھی آتے رہے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ عرصہ تک اہل نجد کو حج سے روک دیا گیا۔ لیکن سخت معرکے دراصل مصریوں ہی کے ساتھ پیش آئے، باب عالی نے تنگ آکر محمد علی پاشا خدیو مصر کو اہل نجد کی "سرکوبی" پر مامور کیا (۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء) "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" اسی موقع پر کہا گیا ہے۔ محمد علی پاشا اور ان کے صاحبزادوں ابراہیم اور طوسون نے خوب خوب کارہائے نمایاں انجام دیے۔ افسوس کہ امرائے نجد کی تاریخ اور جنگوں کی تفصیل اس خلاصہ کی گنجائش سے باہر ہے ورنہ کچھ عرض کرنے کی جرأت ہوتی۔

"اور یہ قوم (یعنی نجدی۔ عربی تعبیر والقوم ہے) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور ایک امام کے پیچھے خشوع اور خضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔ اگر جنگ کے اثنا میں کہیں نماز کا وقت آگیا، تو موزن فوراً اذان دیتے ہیں اور نماز خوف پڑھتے ہیں۔ ایک جماعت آگے بڑھتی ہے، پھر دوسرا گروہ نماز کے لئے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور ہماری سپاہ حیرت سے منہ تاکتی ہے، ان بیچاروں نے دیکھنا تو درکنار، سنا بھی نہیں "لانھم لم یسمعوا بہ فضلاً عن رؤیتہ" (جلد ۳ ص ۱۴۰۔ حوادث ۱۲۲۷ھ) (مطبوعہ مصر ۱۲۹۷ھ)

اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

عبداللہ بن سعود (ط) امیر سعود کی وفات (۸ جمادی الاول ۱۲۲۹ھ = ۲۷ اپریل ۱۸۱۴ء) پر اس کا بڑا بیٹا عبداللہ جانشین ہوا۔ جو اپنے باپ سے گو بہادر زیادہ تھا، لیکن حزم اور تجربہ کی اس میں کمی تھی۔ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے کو ابراہیم پاشا کے قدموں پر ڈال دیا، محمد علی نے اسے آستانہ بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے باب عالی سے جان بخشی کی سفارش کی تھی، لیکن قضا صحن مسجد میں لکی تھی، ایا صوفیہ کے سامنے اسے قتل کیا گیا (۱۲۳۴ھ = ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء) اس کے ساتھ ساتھ خاندان کے دو دیگر رکن بھی تہ تیغ کئے گئے۔

(ی) ابراہیم پاشا اور مصریوں کا نجد سے براہ راست تعلق جنگ کے بعد گویا ختم ہوگیا لیکن مصری فوج اپنی "رحم دلی" اور "مسلمانیت" کا غیر فانی نقش چھوڑ گئی، یہ آخری فتح کے بعد (۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء) جب کہ عبداللہ ہتھیار ڈال چکا تھا، محمد علی پاشا نے اپنے صاحبزادے ابراہیم پاشا (سپہ سالار) کو کہلا بھیجا کہ درعیہ (آل سعود کا پہلا پایہ تخت) برباد کر دیا

جائے، درخت اور باغات اجاڑدئے جائیں، پھر کیا تھا، بوڑھے بچے، کمزور اور بیمار، سب یکساں عتاب کا شکار ہوئے۔ تمام شہر کھود کر پھینک دیا گیا اور چند ہفتوں میں لہلہاتا ہوا باغ جل کر خاک بھسم ہوگیا ....

(... .... ملخص از تاریخ نجد (آلوسی) صفحہ ۲۲-۲۶) یہ وہ درعیہ ہے، جو شیخ کے قیام سے پہلے (۱۱۵۷ھ) ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، شیخ کی دعوت نے اسے مرکزیت بخشی اور آل سعود کی کوششوں اور حوصلہ افزائیوں سے تھوڑے عرصہ میں ایک آباد اور خوش حال شہر بن گیا۔ عثمان بن بشر نے درعیہ کی خوش حالی، رونق اور تجارتی مرکزیت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے؛ دور سعود بن عبدالعزیز کے دور حکومت کے اپنے چشم دید تاثرات قلم بند کئے ہیں۔

"یہ سارا کرشمہ تھا بے خبری کا۔ اللہ سے بے خبری، دین سے بے خبری، اپنے بھائی مسلمانوں سے بے خبری، بلکہ خود اپنے نفس سے بے خبری کا۔"

عبداللہ کے ساتھ ساتھ شیخ کے تربیت کردہ اور اصلاح یافتہ نجد کی سیاسی (۱) برتری کی پہلی کوشش ختم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ہم اس سلسلہ کو یہیں ختم کرکے رخصت ہوتے ہیں۔

یہ مختصر تحریر شیخ الاسلام کی سیرت کے پہلے دو بابوں (ذاتی حالات اور سیاسی برتری) کا خلاصہ ہے، جو بالکل ادھورا ہے، خیر حالات تو کچھ آ بھی گئے ہیں، لیکن شیخ کی دعوت، اور تصنیفات وغیرہ کا تو بالکل ذکر بھی نہ آسکا، اصل کتاب میں یہ چیزیں یکجا ملیں گی

حاشیہ صفحہ ۲۲)

(۱) نجد جدید کی تاریخ کے تین دور ہو سکتے ہیں۔

(۱) درعیہ اور ریاض کے سربلندی سے لے کر ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء تک جب کہ مصریوں کے حملہ کے باعث ان کی قوت تتر بتر ہو گئی۔

(۲) ترکی اور فیصل کی بازیابی کی کوششوں (۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء) سے شروع ہو کر ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء تک، جب کہ محمد بن عبداللہ آل الرشید (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء - ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) نے حائل اور ریاض نجد کی دونوں ریاستوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے مجتمع کر لیا۔

(۳) تیسرا زریں دور ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ موجودہ فرماں روا عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود نے آل الرشید سے ریاض واپس لے لیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۹۲ کا)

نکلے تھے اس کے طلسم سے ساری زندگی متاثر رہی۔ یعنی وہ ساری عمر اپنے ذہن ودماغ کو یونانی فلسفہ کے اثر سے پورے طور پر آزاد نہ کر سکے۔ ان کی عملی زندگی میں اس کا بہت ہی گہرا اثر پڑا۔ وہ ضرورت سے زیادہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گوشۂ تنہائی میں گذار دیا۔

علامہ سید جمال الدین افغانی

(مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان)

انیسویں صدی عیسوی کا ایک عظیم المرتبہ مفکر و مجاہد اسلام جس طرح کسی قوم کے افراد تاریخ پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ بھی افراد کی تخلیق کرتی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کو ہم اس لحاظ سے دنیائے اسلام کے لئے ایک مبارک صدی کہہ سکتے ہیں کہ اس صدی میں عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں بڑے بڑے نامور مفکر اور عظیم المرتبت علماء و زعماء اسلام پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے۔ اور ان سے زیادہ اپنے خلوص۔ اور عملی جد وجہد سے مسلمانوں میں ایک فکری و ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کے اس ذہنی انقلاب کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں ایک لائق ذکر قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں اور بین الاقوامی سیاسیات میں نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ ورنہ مغربی طاقتوں کی وسیلہ کاریاں عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں۔ وریورپین تہذیب و تمدن کا عام اثر و نفوذ۔ اور خود مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا فقدان و انہدام۔ ان سب کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آج کرۂ ارضی پر مسلمان کا وجود بحیثیت مجموعی برائے نام ہی ہوتا۔

ولادت اس وقت انہی مفکرین و ابطال اسلام میں سے علامہ سید جمال الدین افغانی کا نام نامی ہمارے مقالہ کا موضوع بحث ہے۔ آپ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں افغانستان کے ایک موضع اسعد آباد میں (جو کنڑ کے قریب ہے) پیدا ہوئے

والد ماجد کا نام سید صفدر تھا جو ایران کی ایک ولایت مازندران کے رہنے والے تھے، ایرانی سپاہ میں ملازم تھے۔ اسی ملازمت کے باعث کسی کام کی وجہ سے حکومت ایران کے حکم سے افغانستان آئے۔ یہاں کی ترب و ہوا ایسی موافق آئی کہ یہیں مستقل قیام کرلیا اور شادی بھی کرلی۔ جمال الدین مرحوم انھیں خاتون سے پیدا ہوئے۔

نسب و حسب | علامہ مرحوم کا تعلق مشہور محدث امام سید علی ترمذی کے خاندان سے تھا۔ اس لئے افغانستان میں ان کا خاندان نہایت معظم و مکرم سمجھا جاتا تھا [۱]

تعلیم و تربیت | سید صفدر نہایت بیدار مغز اور روشن خیال بزرگ تھے، انھوں نے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی توجہ کی ہر علم و فن کی تعلیم کیلئے اس کے کسی نامور استاد کی خدمات حاصل کیں۔ ادھر استعداد اور صلاحیت فطری اور ذہانت و ذکاوت بلا کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی تھی اٹھارہ برس کے سن میں عربی، عقلی اور شرعی علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہوگئے۔ جارج کیٹنے کا بیان ہے کہ علامہ نے ان علوم و فنون کے علاوہ فوجی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی تھی۔

جہان پیمائی | ان علوم و فنون سے فارغ ہوکر آپ ہندوستان آئے اور یہاں ایک سال مقیم رہکر کچھ یورپین علوم و فنون کا اور اُن کے اسالیب و طرق کا مطالعہ کیا۔ پھر

---

[۱]: ۔ سید جمال الدین مرحوم کے موضع پیدائش میں اختلاف بہت ہیں بعض کا خیال ہے کہ آپ سعد آباد میں پیدا ہوئے جو فارس کا ایک شہر ہے اور ہمدان کے قریب ہے۔ مگر علامہ کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ المصری جو ہم نے اوپر تحریر کیا اور دنیائے اسلام کے نامور مفکر و اہل قلم امیر شکیب ارسلان نے بھی اسی کی تائید کی ہے

یہاں سے حجاز چلے گئے۔ لیکن ایک سال تک عربی ممالک میں سیاحت کرتے رہے ١٢٧٣ھ
میں مکہ معظمہ پہونچے اور حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہوئے یہاں سے واپس ہوکر آپ پھر
افغانستان آئے، اور مختلف مناصب پر فائز رہے۔ پھر امیر شیر علی کے عہد حکومت میں افغانستان
کو بھی خیرآباد کہکر آپ ہندوستان آئے۔ یہاں حکومت برطانیہ کی سخت نگرانی میں
کچھ دنوں رہنے کے بعد مصر چلے گئے۔ مصر میں چالیس دن قیام کرکے حجاز آئے۔ اور حجاز
سے ٹرکی گئے۔ یہ واقعہ ١٢٨٧ھ کا ہے۔ یہاں چھ مہینہ قیام کرنے کے بعد مجلس معارف کے
ایک رکن منتخب ہوگئے۔ اس زمانہ میں مجلس کے صدر عالی پاشا تھے، کچھ دنوں بعد
ٹرکی کا شیخ الاسلام علامہ کا دشمن ہوگیا۔ تحریروں اور تقریروں میں علانیہ مخالفت کا
مظاہرہ ہونے لگا۔ جمال الدین بھی دبنے والے نہ تھے۔ ہنگامہ زیادہ گرم ہوا تو ترکی
حکومت نے آپ کو جلا وطن کردیا، اب آپ ١٢٨٨ھ کے اوائل میں پھر مصر آئے۔
اسمٰعیل پاشا کا عہد تھا، حکومت مصر نے علامہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ایکسو بیس
گنی سالانہ محض حق ضیافت کے طور پر دینا منظور کرلیا۔ علامہ کئی سال تک مصر میں مقیم
رہے۔ طلبا کو اپنے مکان میں درس دیتے تھے۔ اُن کو خطابت اور تحریر کی مشق کراتے
تھے اور سب سے بڑھکر یہ کہ اپنے لکچروں اور تقریروں کے ذریعہ عام مسلمانوں میں اور
طلبا میں دونوں میں ایک انقلابی اور آزاد ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔
علامہ کی لیاقت وقابلیت اور اُن کے ساحرانہ طرز خطاب و انشا نے انھیں بہت جلد
مصر کی ایک نمایاں اور ممتاز ترین شخصیت بنا دیا۔ اب حکومت کو کچھ خطرہ پیدا ہوا،
اس لئے اس نے انگلستان کے قونصل جنرل کے ایماء پر علامہ کو مصر سے چلے جانے
کا حکم دیدیا۔ چنانچہ آپ اپنے ایک ملازم ابو تراب کے ہمراہ ١٢٩٦ھ مطابق ١٨٧٩ء

میں مصر کو الوداع کہکر حیدر آباد دکن آئے یہاں کے یکسالہ قیام میں ایک رسالہ فارسی زبان میں لکھا جس میں سر سید احمد خان اور ان کے گروہ کے مذہبی خیالات کی پُر زور تردید کی گئی تھی۔

حیدر آباد سے کلکتہ آئے۔ اور کلکتہ سے لندن چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد پیرس چلے گئے۔ پیرس میں ان کا قیام ۱۸۸۳ء کے آغاز سے ۱۸۸۵ء تک تین سال رہا۔ العروۃ الوثقٰی کا اجراء اور ان قیام میں یہاں سے انہوں نے اور انکے تلمیذ رشید محمد عبدہ المصری نے ملکر عربی زبان کا ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنا شروع کیا جس کا نام العروۃ الوثقٰی تھا۔ پیرس اور لندن میں قیام کرنے کے باعث ان کے تعلقات یورپ کے بڑے بڑے علماء سیاسیات و ادبیات اور نامور فلاسفۂ زمانہ سے ہو گئے تھے۔ مشہور فلسفی رینان نے علامہ کے متعلق لکھا ہے۔

"میں جب جمال الدین افغانی سے بات چیت کرتا تھا تو بڑے بڑے فلاسفۂ اسلام مجکو یاد آجاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابن سینا یا ابن رشد سے گفتگو کر رہا ہوں"[1]

العروۃ الوثقٰی کے مضامین نہایت پُرجوش اور ولولہ انگیز ہوتے تھے اسکا مقصد عالم اسلام میں ذہنی بیداری اور فکری انقلاب پیدا کرنا تھا۔ یہ پرچہ تمام مشرقی اور مغربی ممالک میں جاتا تھا، مصر اور ہندوستان میں ہی اس کی اشاعت کافی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ قیمتی مجلہ آٹھ ماہ میں اٹھارہ پرچے شائع کرکے ہی ختم ہو گیا۔

---

[1]: دیباچہ العروۃ الوثقٰی ص ۹۔

آخری اشاعت ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ میں ہوئی تھی۔

۱۳۰۳ھ میں علامہ نے ایران کا رخ کیا۔ شاہ ناصرالدین قاچار کا عہد حکومت تھا، اور علامہ خود شاہ کے بلائے ہوئے گئے بھی تھے۔ یہاں حکومت کی جانب سے بڑا اعزاز و اکرام ہوا۔ یہاں تک کہ اہم ملکی معاملات میں شاہ ایران آپ سے بھی مشورہ کرتا تھا۔ مگر ایران کی سرزمین بھی آپ کے لئے ناسازگار ثابت ہوئی تو آپ نے روس کا عزم کیا۔ یہاں آپ کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، عام جلسوں میں تقریریں کرائی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے موقر جرائد و اخبارات آپ کے مضامین و سیاسی افکار اہتمام سے شائع کرتے تھے، ۱۸۹۹ء میں آپ نے پھر پیرس کا رخ کیا، ارادہ یہ تھا کہ وہاں کی عظیم الشان نمائش میں شریک ہوں، راستہ میں "میونک" میں شاہ ناصرالدین سے ملاقات ہوگئی۔ شاہ نے بجد اصرار کیا کہ علامہ ایران چلیں۔ آپ نے پہلے تو انکار اور عذر و اعتذار کیا۔ مگر بعد میں رضامند ہوگئے۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ بھی سید جمال الدین مرحوم نے اردگرد اصلاح طلب نوجوانوں کا بڑا وسیع حلقہ قائم کیا۔ تو شاہ کو ان کی ہر دلعزیزی سے خطرہ پیدا ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن جب کہ سید مرحوم علیل تھے۔ شاہ نے پانسو مسلح سپاہی بھیجکر آپ کو ایران کی سرحد سے باہر نکال دیا۔ اب علامہ بصرہ آئے۔ اور ایک مدت یہاں مقیم رہکر اصلاح کا کام کرتے رہے۔

علامہ کی سحر طرازیوں نے نوجوانانِ ایران کی رگوں میں حریت طلبی کا گرم خون دوڑا دیا تھا۔ اور ادھر شاہ اپنی اغیار نوازانہ پالیسی، اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت سے باز نہیں آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اسے اپنے سر سے ہی سبکدوش ہونا پڑا۔ ۱۸۹۲ء میں آپ پھر لندن آئے، آٹھ مہینہ قیام کیا۔ دوران قیام میں یہاں سے

ایک ماہانہ مجلہ "ضیاء الخافقین" شائع کرنا شروع کیا۔ یہ مجلہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں سفیر ترکی مقیم لندن کی وساطت سے سلطان عبدالحمید نے علامہ سید جمال الدین کو آستانہ آنے کی دعوت دی۔ علامہ نے بوجوہ انکار کر دیا۔ لیکن سلطان نے پھر دوبارہ بڑے اصرار کا خط لکھا۔ علامہ اس سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے شرط پیش کی کہ اچھا! جب کبھی میں ترکی سے یورپ آنا چاہوں گا تو مجھکو اس کی اجازت دیدی جائے گی اور کوئی روک ٹوک نہ کی جائے گی" سلطان نے اس شرط کو منظور کر لیا، تو اب علامہ ٹرکی کے لئے روانہ ہوئے۔ قسطنطینہ میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ رہائش کے لئے ایک عظیم الشان اور پُر فضا مکان کے علاوہ ۷۵ گنی ماہوار بطور وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ بظاہر علامہ کو یہاں ہر قسم کا آرام تھا اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جاتا تھا، لیکن ۱۸۹۶ء میں ایک جرمنی کے سیاح نے علامہ مرحوم سے ملاقات کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی۔

"علامہ کا یہاں کا قیام ایک طرح کی اسارت ہے جس پر سونے کی ٹیپ ٹاپ ہو رہی ہے۔"

وفات | پانچ سال یہاں قیام کرنے کے بعد آپ مرض سرطان میں مبتلا ہو گئے جس سے جانبر نہ ہو سکے اور آخر کار بروز سہ شنبہ ۹ مارچ ۱۸۹۶ء کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انتقال کے بعد فوراً سلطان نے اپنے آدمی بھیجکر علامہ مرحوم کے کاغذات اور اُن کے مولفات پر قبضہ کر لیا جامع تشویقیہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور اس کے قریب ہی ایک قبرستان میں دفن ہوئے۔

ذاتی اخلاق وعادات | علامہ جلیل القدر عالم وفاضل ہونے کے علاوہ اخلاق فاضلہ کے بھی مالک تھے۔ خودداری۔ اور غیرت وحمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فیاضی اور سیر چشمی حد درجہ تھی۔ کھانا کم کھاتے تھے، البتہ چائے اور سگریٹ کے بہت عادی تھے، عمر بھر مجرد رہے۔ کبھی شادی نہیں کی، جو بات کہتے تھے بے دھڑک اور بے خوف تردید کہتے تھے۔ اظہار حق میں کسی بڑی سے بڑی دنیوی طاقت کا رعب داب ان کے لئے مانع نہیں ہوتا تھا۔

تصنیفات | علامہ کتابوں کے مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔ شہر بشہر اور ملک بملک پھرتے رہنے کے باوجود کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اُن کے ساتھ رہتا تھا اور انہیں خواہ کوئی حالت ہو، جب کبھی موقع ملتا تھا بڑے غور وخوض اور توجہ وانہماک سے مطالعہ کرتے تھے، مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین بھی کثرت سے لکھتے تھے۔ العروۃ الوثقیٰ میں جو مقالات سپرد قلم کیئے وہ کتابی شکل میں بیروت سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ علامہ کی اقلمی یادگار "نیچریوں کی تردید میں" ایک رسالہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا تھا، مفتی محمد عبدہ مرحوم نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اور شروع میں علامہ کے حالات وسوانح پر مشتمل ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا۔ امیر شکیب ارسلان فرماتے ہیں کہ مرحوم نے افغانیوں کی ایک تاریخ بھی لکھی تھی "۔[۱]

علامہ اور تحریک اتحاد اسلامی | علامہ سید جمال الدین مرحوم کے بہت ہی مختصر حالات زندگی جو اوپر بیان ہوئے ان سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ علامہ نے کسی ایک ملک

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۳۰۱ ۔

میں زندگی بسر نہیں کی، بلکہ وہ عمر بھر ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور دوسرے سے تیسرے ملک میں پھرتے اور سفر کرتے رہے۔ اس کی وجہ سیر و سیاحت کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ دراصل اُن کے درد مند دل میں دنیائے اسلام کے عام انحطاط و تنزل کا بڑا رنج تھا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مغل سلطنت وحکومت کا ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ تھا وہ بھی گل ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایران۔ افغانستان۔ ٹرکی۔ اور مصر میں جو اسلامی حکومتیں قائم ہیں وہ کہنے کو تو آزاد ضرور ہیں۔ لیکن یورپین سیاست کے بازیگروں نے ان کو بھی اپنی حرص و آز کا جولانگاہ بنا کر ان میں اپنا سیاسی نفوذ واثر قائم کرنا شروع کر دیا ہے، پھر زیادہ افسوس اور شرم کی بات یہ ہے کہ یورپین حکومتیں اپنی شاطرانہ چالوں میں پوری سرگرمی اور جوش وخروش کے ساتھ مصروف ہیں۔ مگر خود اسلامی حکومتیں غفلت کی نیند سو رہی ہیں اور انہیں گویا خبر ہی نہیں ہے کہ دشمنوں نے ان کی جمعیت کو پریشان کر دینے کے کیا کچھ منصوبے قائم کر رکھے ہیں۔ علامہ بیدار مغز، روشن ضمیر، اور صاحب تدبیر و سیاست بزرگ تھے انہوں نے اسی وقت محسوس کر لیا کہ اسلام سیاسی طاقت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس اگر یورپین قوموں کی دسیسہ کاریوں۔ اور ادھر اسلامی حکومتوں کی سہل انکاریوں کا عالم بھی رہا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ یورپین حکومتیں ایک دن تمام اسلامی ممالک پر پورے طور پر قابض ہو جائیں گی! اور پھر مسلمان یہودیوں کی طرح ذلیل وخوار زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیگا۔

دنیائے اسلام کی عام زبون حالی اور اس کے مستقبل کے متعلق ان شدید خطرات کا احساس تھا جو علامہ کو ایک گھڑی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا، انہوں نے

واقعی طور پر محسوس کیا کہ مسلمانوں کے بچنے کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ دنیائے اسلام کے تمام ملکوں میں ایک گہرا اور مضبوط رشتہ اتحاد و مواخات پیدا کر دیا جائے اور اُن میں جو لامرکزیت پیدا ہو گئی ہے اُس کو فنا کر کے سب کو ایک مرکز خلافت سے وابستہ کر دیا جائے۔ بالفاظ مختصر کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کی زندگی کا واحد مقصد اور اہم نصب العین اسلامی ملکوں میں عالمگیر اتحاد پیدا کرنا۔ اور ان کو سیاسی اعتبار سے اتنا طاقتور بنا دینا تھا کہ یورپ کی کسی حکومت کو ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے تک کی جرأت نہ ہو۔

یہی وہ عظیم الشان مقصد تھا جس کو لئے ہوئے وہ ادھر سے ادھر پھرتے رہے اخبارات میں آرٹیکل لکھے۔ شہر بشہر تقریریں کیں۔ مصر اور آستانہ اور ایران میں عرصہ تک قیام کر کے درس دیا۔ اور اس طرح ان ملکوں کے نوجوانوں میں حریت فکر استقلال وطن اور جوش عمل کی نئی اور تازہ روح پھونکدی اور اس نہج سے ایک عام اسلامی انقلاب کے لئے راہ ہموار کر دی۔ علامہ مرحوم پر جیسا کہ عام طور پر مصلحین قوم کے ساتھ کیا برتا رہا ہے۔ بد باطن علماء کی طرف سے الحاد و زندقہ کے فتوے لگائے گئے۔ ان کے خلاف مخالفت و عداوت کے شدید ترین ہنگامے اٹھائے گئے۔ کئی مرتبہ انہیں قید و بند سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اور عالم نے کسی و کس مپرسی میں جلا وطنی کی زہرہ گداز صعوبتیں بھی انگیز کرنی پڑیں لیکن اسلامی انقلاب کے اس علمبردار کے عزم و ہمت میں ذرا تنزلزل اور ضعف پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوا تو یہی کہ۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

قوم کے ادنیٰ سے ادنیٰ مفاد کے مقابلہ میں انہوں نے اپنے بڑے سے بڑے ذاتی مفاد کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ جب کبھی اعلان حق۔ اور اظہار صواب کا موقع آیا۔ انہوں نے بے تامل اور عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس فرض کو ادا کیا اور آفات و آلام کی حوصلہ شکن شدت ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے قدم استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکی۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اسلامی ملکوں کے علاوہ علامہ مرحوم یورپین ممالک میں اور خصوصاً لندن اور پیرس میں بھی کافی عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ اس کا بھی مقصد یہی تھا۔ کہ یورپ میں رہکر وہ یورپین سیاست اور اس کے پوشیدہ پہلوؤں سے واقفیت بہم پہونچائیں اور ان لوگوں کی ذہنیت سیاسی ارتقاء فکری۔ اور عام میلانات و رجحانات سے با خبر رہیں۔ نیز جہاں تک ہو سکے باہمی تبادلۂ خیال اور مذاکرہ کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو غلط فہمیاں یورپ میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کریں۔

مرحوم نے مفتی محمد عبدہ کی شرکت میں جو ہفتہ وار مجلہ پیرس سے اور ماہانہ رسالہ لندن سے نکالا تھا۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا نصب العین اسلام کی طرف سے مدافعت اور مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور بنانے کے سوا کوئی اور چیز تھی ہی نہیں، فرنچ انسائیکلوپیڈیا میں مشہور مستشرق گولڈزیہر سید جمال الدین پر اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

جمال الدین کے تمام حرکات و اعمال کا واحد مقصد یہ تھا کہ اسلامی ملکوں کو یورپین تسلط سے اور اجنبی استیلاء و اقتدار سے بالکل آزاد کرا لیا جائے اور پھر ان

ملکوں میں آزاد ادارے قائم کرکے انھیں اس قابل بنا دیا جائے کہ یہ اپنے داخلی امور کا انتظام و انصرام کسی بیرونی مدد کے بغیر خود ہی کر سکیں۔ علامہ جمال الدین چاہتے تھے کہ تمام اسلامی ملکوں کو خلافت اسلامیہ کے اردگرد جمع کر دیں اور اس طرح عالمگیر اتحاد اسلامی کی اساس قائم کر دیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمال الدین اپنے قلم اور زبان سے اتحاد اسلامی کے نظریہ کے زبردست حامی اور مؤید تھے"۔[۱]

علامہ کو دنیا سے رخصت ہوئے ۴۴ سال کے قریب ہو گئے۔ لیکن غور کرو اتنی طویل مدت پہلے اسلامی ممالک سے متعلق علامہ نے جو خطرات محسوس کئے تھے۔ وہ آج کس طرح ایک ایک کر کے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔ کہنے کو آزاد ہیں۔ مگر جمال الدین کی روح اب بھی ان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!!!

پھر اس پر بھی غور کر دکہ کیا ان تمام مصائب و آفات کا بنیادی سبب یہ نہیں ہے کہ عالمگیر اتحاد اسلامی کا وہ خواب جو اسلامی حکومتوں نے ۱۹۳۴ء میں میثاق سعدآباد کے روپ میں دیکھا تھا وہ یورپ کی مسلط کی ہوئی لعنت ''وطنیت'' کے سامنے ایک خواب پریشان ہو کر رہ گیا؟۔

سعید احمد اکبرآبادی ایم۔اے۔

---

[۱] بحوالہ حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۲۰۱۴۔

جمال الدین افغانی

(از جناب اسلوب احمد انصاری متعلم بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ماضی قریب میں ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ سازی کا بہت بڑا حصہ جمال الدین افغانی کی گہری شخصیت سے وابستہ ہے۔ اُنہوں نے اپنے وجدان اور بصیرتِ سیاسی سے ایک ہی نظر میں ماضی کی سربلندی، حال کی زبوں حالی اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیکر دماغ میں خلش، قلب میں حرکت اور عمل میں ذوق و شدت پیدا کی۔ اسلامی سیاست کو ایک بلند تر اور قوی تر نہج پر لانے کے لئے اپنی زبان و قلم کی پوری طاقت صرف کردی مدبرین کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آمادۂ عمل کیا۔ علماء کے جمود اور قدامت پسندی، تنگ نظری اور تن آسانی پر کاری ضرب لگائی۔ مسلمان سلاطین کی شہنشاہیت اور مطلقیت کے طلسم کو ایک "ضربِ کلیمی" سے توڑ دیا۔ بے حس اور بے جان مشرق کو جو غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو مغرب کی وسیع استعماریت میں جذب کرتا چلا جارہا تھا۔ بآوازِ بلند للکار کر اس خطرہ سے آگاہ کردیا۔ احساس اور حمیتِ قومی کی۔ جو نیم سوختہ چنگاریاں سطح کے نیچے چمک رہی تھیں، اُنہیں پوری طرح سلگا دیا۔ اور مسلمانوں کے ہیولے قومی کو گوشت و خون عطا کیا۔ اغیار کے منصوبے ایک طرف، اور اپنی غفلت اور بے حسی دوسری طرف، قریب تھا، کہ اسلامی سیاست کا رہا سہا زور بھی ختم ہو جائے۔ مگر جمال الدین افغانی کی پُرشور نوائے شوق نے اس دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اور اس خزاں دیدہ چمن کو پیامِ بہار دیکر اسے برگ و بار سے آراستہ کیا۔ ان کی شخصیت اور پیام کے اثرات اتنے دوررس اور آفاق گیر ثابت ہوئے۔ کہ انہوں نے مسلمانوں کے زاویۂ فکر و نظر میں زبردست تغیر پیدا کردیا۔ مصر، ترکی اور ایران کے انقلابات

کی تاریخ جمال الدین افغانی کی سیاسی بصیرت کا ایک پرتو ہے! اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے مشن کی پوری کامیابی نہ دیکھ سکے۔ مگر ان کے طریق فکر نے اسلامی ذہن میں جو تخم ریزی کی تھی۔ اُس کی دمیدگی اور بالیدگی آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ کے پیچھے اُس زمانہ کی شخصیتیں کام کیا کرتی ہیں۔ انہی سے تاریخی حقائق عالم وجود میں آتے ہیں۔ ذہنی اور عملی اخلاقی اور سماجی انقلابات کی بنیاد پڑتی ہے۔ قومی فضا کا رنگ بدلتا ہے! اور اجتماعی شعور میں تیزی اور ذکاوت پیدا ہوتی ہے۔ جمال الدین افغانی کی شخصیت عالم اسلامی میں یہی درجہ رکھتی ہے۔ اور ان کے کارناموں کے ساتھ اُس زمانہ کی تاریخ کا دامن بندھا ہے' اسلامی ممالک کی موجودہ سیاسی بیداری اور تنظیم کا ماخذ اُس پیام میں تلاش کیا جا سکتا ہے جسے جمال الدین افغانی کی شعلہ نوائی نے ہر سمت میں منتشر کر دیا۔

ممالک اسلامی کے سیاسی اضمحلال اور دول یورپ کے استعماری رجحانات کا تانا بانا جمال الدین افغانی کے کارناموں کا تاریخی پس منظر ہے۔ جس طرح کائنات کا ایک نظام کہنہ دوسرے نظام نو کے لئے جگہ پیدا کرتا ہے۔ جہاں ایک پتی پژمردہ ہونا شروع ہوتی ہے۔ اُس کے پاس ہی دوسری کونپل پھوٹ آتی ہے۔ ہر شکستہ درخت کو پٹ کرنے کے لئے قوی عناصر اُبھر آتے ہیں۔ اور کائنات کا نظام متوازن رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب کسی قوم میں انحطاط کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ تو دوسری قومیں ترقی میں اُس پر چھا جاتی ہیں۔ اور اپنی عظمت وجبروت کا سکہ بٹھا دیتی ہیں تیرھویں صدی میں جب ہلاکو نے اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز بغداد کو اپنی چنگیزیت کا ہدف بنایا۔ اور اسلامی جاہ وحشم کی آخری یادگاروں کو سپرد خاک کر دیا۔ اسپین

میں جہاں ایک عرصہ تک اسلامی علوم وفنون اور خیالات پلے اور بڑھے تھے مسلمانوں کی قوت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اُن کے ہاتھوں سے زمامِ حکومت نکل گئی۔ پھر ۱۶۰۲ء میں جب ترکی کا سیاسی اقتدار جو شمعِ سحر کے مانند عرصہ سے لرز رہا تھا۔ تنزل کی آخری حد پر پہونچ گیا۔ تو یورپ میں استعماری خیالات پرورش پانے لگے۔ مغربیوں کے سینوں میں عزائم کا طوفان موجیں مارنے لگا۔ اسلامی ممالک کی بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر اُن کا ولولۂ حیات تازہ ہو گیا۔ سوئی ہوئی امیدیں جاگ اٹھیں۔ جذبۂ عمل نے اُنہیں بڑھایا اور ابھارا۔ ۱۶۵۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز ہوا۔ شروع میں اس کے مقاصد زیادہ تر تجارتی تھے۔ مگر بعد میں فضا ساز گار دیکھ کر اسی کمپنی نے سیاست اور حکومت کی قبا پہن لی۔ اور انگریزی قوم کی حرص و آز کے لئے نئے نئے میدان تلاش کرنا شروع کئے۔ انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ مقبوضات کی وسعت نے سیاست اور ملک گیری کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ اور وہ نقوش جو ابھی تک دماغوں میں دھندلے اور پھیکے تھے، گہرے اور صاف ہونے لگے۔ اٹھارویں صدی میں جبرالٹر پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے سے مغربی استعماریت کا زور بہت بندھ گیا۔ ادھر مسیحیت بھی سوتے سے چونک گئی اور اس کی تبلیغ کا سلسلہ بھی پہلو بہ پہلو چلنے لگا۔

اسی انقلابی دور میں جب کہ مغربی سیاست اور مسیحیت کے اثرات عالمگیر ہوتے جا رہے تھے۔ بونا پارٹ کی فتوحات نے ان قوموں کی انانیت کو صدمہ پہنچایا۔ اور اس بڑھتی ہوئی رفتار میں کچھ عرصہ کے لئے مزاحمت پیدا ہو گئی۔ ۱۸۰۶ء میں برطانیہ نے جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۴ء میں بحر روم اور مصر کی سیاست بھی اُن کے زیر اثر آ گئی۔ ۱۸۱۹ء میں بحر ہند اور بحر احمر کو

اپنے لئے محفوظ کر لیا۔ ۴۰-۱۸۳۱ء میں فرانس کے اثرات کو مصر سے خارج کر کے اپنی حاکمیت کو مستحکم کر لیا۔ اگر ان تمام قوتوں کے سیاسی پھیلاؤ کا جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ ۱۷۰۴ء سے ۱۷۹۵ء تک انہوں نے جبرالٹر، الجزائر، مراقش، ترکی مقبوضات، شمالی امریکہ اور سیلون پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۴۲-۱۸۳۹ء میں برطانیہ نے ہانگ کانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ اور اس سے اگلے سال نیٹال پر تسلط قائم ہو گیا۔ روس بھی برطانیہ کی اس پیش قدمی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس نے مشرق بعید میں اپنے لئے راستہ نکالنا شروع کیا۔ اس سے برطانیہ کی آتشِ طمع اور بھڑک اٹھی اور اس نے جزیرہ نمائے ملایا کی ریاستوں پر ہاتھ صاف کیا۔ انیسویں صدی کے وسطی دور میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت ترکی تھی۔ جسے برطانیہ، روس، فرانس اور جرمنی کی نگاہیں تاک رہی تھیں۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنا حصہ بٹانا چاہتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں، جو ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، دو دِیا تیموری کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اور مسلمانوں کی کشتی سیاست، جو اورنگزیب کے بعد منجدھار میں پھنس چکی تھی۔ قعرِ دریا کی نذر ہو گئی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوستان پر برطانوی قبضہ مکمل ہو گیا۔

اس دور کے انگریزی مدبرین کی تحریریں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ برطانیہ کے توسیع مملکت کی خواہش دراصل تہذیب انسانی کی خدمت کے جذبہ پر مبنی تھی۔ اُن کا مقصد مقبوضات حاصل کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرنا یا معاشی پیداوار پر قبضہ کر کے تجارت کو فروغ دینا نہیں تھا۔ بلکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ ان پس ماندہ ملکوں میں تمدن کی روشنی سے اجالا کر دیں۔ اور انہیں ناتراشیدگی

کی حالت سے اونچا اٹھاکر تہذیب انسانی کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیں۔ یہ اور بات ہے، کہ اس کی وجہ سے اُن کی استعماریت کی جڑیں مختلف حصصِ عالم میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر اس جذبہ کے جو نتائج مقبوضہ ممالک کی ذہنی، معاشرتی اور معاشی اضمحلال کی صورت میں مترتب ہوئے۔ انہیں اُن کی نیت کا کھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد پھر منظم طور سے تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کا وقت آیا۔ یعنی "تنظیمات" کا دور شروع ہوا۔ اور ۱۸۸۷ء میں پہلی کانفرنس منعقد کی گئی برطانیہ کا یہ اقدام فرانس، اٹلی اور جرمنی کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی شمالی اور جنوبی افریقہ پر دست درازی شروع کر دی۔

ادھر تو حکومت اور سیاست کا یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اور اُدھر دنیائے اسلام پر مصیبت و ابتلا کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ ۱۸۷۲ء میں ترکی حکومت کی کمزوریوں کے خلاف احمد پاشا نے بغاوت کر دی۔ محمد علی پاشا نے مصر کو ترکی سے آزاد کرا لیا۔ اور اسی وقت سے ترکوں کی سیادت کے خلاف عربوں کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ مگر ظلمت اور نور، اندھیرے اور اجالا کا دامن بندھا ہے۔ خزاں کی آمد بہار کا پیش خیمہ ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد پھر اُبھرتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال، فنا اور بقا، فطرت کا ایک لگا بندھا قانون ہے۔ اسی مایوسی اور ناامیدی، انحطاط اور انتشار کے پیچھے امید کی کچھ کرنیں چمک رہی تھیں۔ کاروانِ گم کردہ راہ کو منزل کے چند دھندلے نشانات نظر آنے لگے تھے، افق کے سامنے سے غبار ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ قوم کے جسدِ خاکی میں زندگی کا خون متحرک ہونے لگا تھا۔ ۱۷۷۶ء میں امریکی نوآبادیوں کی جنگِ آزادی نے نیند کے ندیالوں کو چونکا دیا۔ اُس کے بارہ سال

بعد انقلاب فرانس نے جو تاریخِ عالم کی ایک زبردست قوت سمجھا جاتا ہے بہت سے قلوب میں حرارت پیدا کی۔ اور جونہی انہیں اپنی قومی شخصیت کی تباہی کا احساس ہوا۔ اُن میں خودداری اور حمیت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ ترکی اس سے زیادہ متاثر ہوا۔ اور وہاں قوم پرستوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے استبدادی طرزِ حکومت کے خلاف اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ جس کا نتیجہ ۲۶ء میں سلطان محمد دوم کی "تنظیمات" کی صورت میں نمایاں ہوا۔

ممالک اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے ہوا۔ جو سرزمین نجد سے چشمۂ حیات کی طرح پھوٹی۔ اور جس نے مسلمانوں کے ریگ زار قومی کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ اس چشمہ کا ایک سوتا ۴۲ء میں طرابلس میں اُبلا جس نے کچھ تو اپنے مخرج سے حاصل کیا اور کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اور اس لئے اس میں زیادہ جوش اور قوت پیدا ہو گئی۔ یہ سنوسیوں کی تحریک تھی۔ ایران میں مرزا محمد علی باب کی تحریک اٹھی۔ شام میں قوم پرستوں کی جماعت ترکی کی مضمحل حالت سے عربوں کو آزاد کرانا چاہتی تھی۔ تونس میں خیر الدین پاشا کی تحریک چل رہی تھی انیسویں صدی کے وسط میں الجیریا میں عبدالقادر کی تحریک شروع ہوئی۔ اور وسط ایشیا میں روس کے خلاف نقشبندیہ تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ہلکی اور تیز لہریں ایک عام قومی شعور کی غمازی کر رہی تھیں۔

ان مختلف تحریکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ مغربی قوتوں کے خلاف اسلامی ممالک میں ایک عام ردِ عمل شروع ہو چکا تھا جس کے مظاہرے ہر گوشہ میں نظر آتے تھے۔ اس وقت افغانستان کی خاک سے اٹھے ہوئے ایک

"مردِ خود آگاہ" نے آگے بڑھکر اسلامی مشرق کے مردہ جسم میں صورِ اسرافیل پھونک دیا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ افغانی کی تحریک کے لئے میدان صاف ہو چکا تھا۔ لیکن اس بنیاد پر انہوں نے اسلامی اتحاد کی جو شاندار عمارت اُٹھائی۔ وہ فی الحقیقت ان کی صناعی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ سنوسیوں کے تبلیغی مراکز نے جنوبی افریقہ سے چین تک انکے مشن کا قومی احساس پیدا کر دیا۔ مگر یہ جمال الدین کا کارنامہ تھا۔ کہ انہوں نے بہت قلیل عرصہ میں اسلامی دنیا میں زبردست ذہنی اور عملی انقلاب کی بناء ڈال دی۔ اور اپنی "نوائے تلخ" سے ہر طرف ایک تلاطم اور جوش پیدا کر دیا۔ وہ جن حالات میں پیدا ہوئے۔ اُن کا اقتضاء ہی یہ تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو اس جد و جہد میں محو کر دیتے کچھ عرصہ تک تو وہ اپنے وطن مالوف میں بیٹھے افغانی سیاست کے مدوجزر کا تماشہ دیکھتے رہے۔ قیامِ افغانستان کے زمانہ میں انھوں نے وہاں کی قومی زندگی میں حرکت پیدا کی۔ اور اصلاحات کی کوشش میں مصروف رہے۔ مگر بالآخر وہ شیر علی اور اس کے وزیر محمد رفیق سے بد دل ہو کر اپنے وطن کی سیاست سے ناامید ہو گئے! اور عالمِ اسلامی کے متعلق وہ خواب دیکھنے لگے۔ جس کی تعبیر میثاقِ سعد آباد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ محمد رفیق اور شیخ کی کشمکش کا اگر کوئی خاطر خواہ فیصلہ ہو جاتا۔ تو افغانستان کی تاریخ اُن انقلابات سے پُر نہ ہوتی۔ جو خون ریزی، انتشار اور بے چینی پر منتج ہوئے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اس بے اطمینانی اور بدگمانی ہی سے عالمِ اسلامی میں شیخ کے شاندار کارناموں کا آغاز ہوا۔ شیر علی نے خارجی سیاست کے رموز سے ناآشنا رہ کر انگریزوں کی مدد حاصل کی جس سے قومی سلطنت میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ اپنے ملک کی خونریزیاں اور

کشمکش میں جمال الدین نے اپنے ارادوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لئے کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ درباری سازشیں، انفرادی مفاد سیاسی تدبر کا فقدان، باہمی نفاق اور کشمکش کس طرح قومی سلطنت کے لئے زہر ہلاہل کا کام دیتے ہیں۔ اُن کے تجربہ، ایمان اور قوتِ عمل نے اُن کے پیام میں ہمہ گیری، حوصلوں میں بلندی، عمل میں شدت، شخصیت میں رفعت اور کردار میں استواری پیدا کر دی۔

یوں تو جمال الدین افغانی کی زندگی اسلامی سیاست کے بعض اہم پہلوؤں پر حاوی ہے اور اُن کی زندگی کے واقعات کو ترتیب دینے سے اُس زمانہ کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ مگر یہاں ہم صرف اُن معرکۃ آلارا اقدامات کا ذکر کریں گے۔ جو تاریخی حیثیت سے ایک درجہ رکھتے ہیں۔ عثمانیوں کے ابتدائی دور میں اور سترھویں صدی کے آخر تک بھی جب کہ سلطان محمدؒ فاتح کے جانشینوں میں کچھ سکت باقی تھی۔ یورپ کی سلطنتیں ترکی سے خائف رہیں۔ اور یورپ میں اسلامی سلطنت کا وقار قائم رہا۔ مگر جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی۔ اور عثمانی سلاطین راگ اور رنگ میں کھوئے گئے۔ تو پھر یورپین ریاستوں میں ترکی حکومت کے حصے بخرے کرنے کے متعلق معاہدے ہونے لگے۔ دارالسلطنت میں "جان نثاروں" کی قوت کو اتنا فروغ ہوا۔ کہ اصلاحات کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ یورپ کی ریاستوں نے اس انحطاط کو مکمل کرنے کے لئے بلقان کی ریاستوں سے سازباز شروع کر دی۔ اور انہوں نے ترکی کی اطاعت سے منہ موڑ لیا۔ مصر میں خدیو محمدؐ علی خودمختار ہونے لگا۔ عرب میں وہابی تحریک نے زور پکڑا۔ روس، بحرۂ اسود اور بحرۂ روم میں اپنے

لئے راستہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے آبنائے باسفورس پر قبضہ کرکے اپنے لئے خاص خاص مراعات حاصل کرلیں۔ اُدھر اُس نے اپنے آپ کو یونانی کلیسا کے پیرووں کا حامی ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ اور عالمگیر سلافی اتحاد کا فتنہ اٹھایا۔ تاکہ ترکی سلطنت کی جڑ بنیاد کو ہلا دیا جائے۔ اس تحریک کے پیچھے مذموم قومیت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یونان بھی ترکی کی اطاعت سے آزاد ہوگیا۔ اور جب یونانی اپنے جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے شہر ٹری پولیٹیزا میں داخل ہوئے تو انھوں نے صلیب کی خوشی میں دو ہزار مسلمانوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے تہ تیغ کر دیا۔[1]

۱۸۴۰ئ میں عبدالمجید کا دورِ حکومت شروع ہوا۔ میں نے ترکی قوم کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلہ میں سلیم ثالث اور محمود ثانی کو نظرانداز کرکے عبدالمجید کا ذکر اس لئے کیا۔ کیونکہ "تنظیمات" کا دور جس میں جمہور کی بیداری کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اُسی کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اُن اصلاحات کا نفاذ جو "خطِ شریف" کے نام سے تجویز کی گئی تھیں۔ عمل میں نہ آسکا۔ مگر انہوں نے ترکی کی جدید تاریخ سازی میں قوتِ محرکہ کا کام دیا۔ اور ترکوں کو اس قابل بنا دیا۔ کہ وہ اپنی جگہ کھڑے ہو سکیں۔ اور یورپین قوموں کے خلاف مدافعت کر سکیں "تنظیمات" کے بانیوں کے ذہن میں انفرادی آزادی کا جو تصور تھا۔ وہ فی الحقیقت ترکی کی موجودہ بیداری اور قوت کا سبب بنا۔ ۱۸۶۱ئ میں سلطان عبدالمجید کا انتقال ہوگیا۔

---

[1]:۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش۔

اور سلطان عبد العزیز تخت نشین ہوئے ۱۸۶۷ء میں انھوں نے لندن و پیرس کا سفر کیا۔ اور اُن کے اس سفر کے ساتھ ترکی کی قسمت کا ستارہ بالکل ہی ڈوب گیا۔ مغربی طلسم زاروں کی اُس فضا نے جہاں کا چپہ چپہ فردوس بہ داماں اور کفِ گلفروش ہے۔ اور جہاں ہر ہر قدم پر رنگ و بو کا اہتمام رہتا ہے۔ عبد العزیز کے دماغ کو ابیقوریت (Epicureanism) کی طرف مائل کر دیا جس کے بعد اُس کا ذہن رموزِ مملکت کی عقدہ کشائی کا کہاں متحمل ہو سکتا تھا۔

۱۸۷۱ء میں جب کہ ترکانِ احرار کی جماعت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ شیخ جمال الدین افغانی ترکی پہنچے آپ کو امورِ معارف کی اصلاح کے لئے انجمن معارف میں شریک کیا گیا۔ اور انجمنِ دانش کے رکن بھی بنائے گئے۔ اُس وقت ترکی میں اسلامی مدارس کی حالت بہت سقیم تھی۔ مسلمان علما ارسطو کے فلسفہ پر جمے بیٹھے تھے! ور علم کی بنیاد استدلال پر رکھی تھی۔ تجربہ اور مشاہدہ کا، جس پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات موجودہ دور کی سائنٹفک روح کی ہمنوا ہیں۔ اُن کے یہاں کوئی دخل نہ تھا۔ اُن کے نصاب میں جدید علوم کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ علوم اصلاح و ترقی کے منافی ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام کی سادہ فطری تعلیم اور وسعتِ نظر، جس میں علوم طبیعیات کو جذب کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت و استعداد موجود ہے۔ جمود طاری ہو گیا۔ اسلامی درسگاہیں وقت کے مطالبے سے بہت پیچھے پڑی تھیں! ور دو نصاب تعلیم اور نقطۂ نظر کی غلطی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ تھیں۔ کہ ان علوم کی تہذیب اور نشو و نما میں حصہ لیکر ترقی کے میدان میں آگے بڑھتیں۔

جمال الدین نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی بے نظیر فصاحت و بلاغت سے ترکی کے نوجوانوں کے دماغوں کو بیدار کیا۔ اور اُس ”سحرالقلوب“ کی آواز اسلامی ممالک کے ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ مگر ترکی کے قدامت پرست علماء خصوصاً شیخ الاسلام تحسین آفندی شیخ کے اجتہاد، وسعتِ خیال اور دقتِ نظر کی تاب نہ لا سکے۔ شیخ اپنی تقاریر میں شہنشاہیت اور مطلقیت پر بھی تنقید کیا کرتے تھے جو شہنشاہیت پسند علماء کو مشتعل کرنے کا باعث ہوئی۔ اسی دوران میں شیخ نے دارالفنون میں تقریر کی۔ اور یہی تقریر ترکی سے اُن کے اخراج کا باعث ہوئی خالدہ ادیب خانم شیخ کے متعلق لکھتی ہیں۔

> انیسویں صدی کے وسط میں مذہبِ اسلام میں تجدید و اصلاح کی کوشش شروع ہوئی اور سنوسی، وہابی، بابی فرقے پیدا ہوئے۔ مگر وہ شخص جس نے سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا۔ کہ قدیم تعلیم کو کس حد تک مسلمانوں کے زوال میں دخل ہے۔ شیخ جمال الدین افغانی تھا۔ وہ افغانستان میں مدتوں سختیاں جھیلنے اور مصیبتیں اُٹھانے کے بعد اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ترکی آیا۔ اور آتے ہی اُس نے اہلِ علم کو متوجہ کر لیا۔ اُس کی کوشش سے تعلیمی اصلاح کی کوشش شروع ہوئی۔ اور حکومت نے اُسے مجلس تعلیمی کا رکن مقرر کر دیا۔ وہ تعلیمیافتہ لوگوں کے مجمع میں تقریریں کیا کرتا تھا۔ ترکی علماء کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ شیخ الاسلام آفندی نے اُس کی تعلیم کو شریعتِ اسلام کے خلاف قرار دیا۔ سنہ ۱۸ء

؍؍

میں شیخ جمال الدین نے پیمبروں کے معاشرتی فرائض کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس نے مخالفت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ شیخ ترکی سے مصر چلا گیا۔ اور علما اپنے مدرسوں میں وہی پرانے سبق رٹاتے رہے"[1]

ترکی سے خارج البلد ہونے کے بعد شیخ مصر آئے۔ جہاں وہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے۔ اُس وقت مصر میں خدیو اسمٰعیل برسر حکومت تھا۔ جس کی بے اعتدالیوں نے مصری حکومت کو تباہ کر ڈالا تھا۔ مصر پر قومی قرضہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ رعایا پریشان اور مضطرب تھی۔ تجارت اور صنعت نہایت کس مپرسی کی حالت میں تھی خدیو انگریزوں کے اشاروں پر رقص کر رہا تھا۔ جو اس کے ذریعہ مصر کا خون چوس لینا چاہتے تھے۔ خدیو کی خواہش صرف یہ تھی۔ کہ اُسے اپنی عیاشیوں کے لئے کافی روپیہ ملتا رہے۔ اُسے قومی مصائب سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کی روح بدمستی سے چور تھی۔ وہ رقص و موسیقی کا دلدادہ تھا۔ ریاست کی کشتی اس کے سامنے ڈوب رہی تھی۔ اور وہ ساحل پر کھڑا اس طوفان اور تلاطم کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ملک کے وسائل دولت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس زمانہ میں نہر سوئیز کا افتتاح ہو گیا۔ اور یورپین سیاست پوری طرح مصر پر حاوی ہو گئی ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کا درمیانی زمانہ مصری قوم پر بہت کٹھن گذرا۔ اس وقت شیخ نے مصری قوم کو مطالبۂ حقوق اور عزت نفس کا سبق پڑھانا شروع کیا۔

ترکی بھی اُس وقت بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔ روس کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازہ پر اس "مریض جاں بہ لب" کے دم واپسیں کا انتظار کر رہی تھیں۔ برلن میں

---

[1]:۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش۔

دول یورپ کی خفیہ کانفرنس اسلامی ممالک خصوصاً ترکی اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ قبرص پر برطانوی قبضہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ فرانس کو تونس پر قبضہ کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ شام میں فرانس کے حقوق کو برطانیہ نے قبول کر لیا تھا۔ مصر میں داخل ہوتے ہی جمال الدین کے فضل و کمال کا شہرہ تمام اطرافِ ملک میں پھیل گیا۔ جامعۂ ازہر کے طلباء نے شیخ سے درخواست کی۔ کہ وہ مستقل قیام کا ارادہ کر لیں۔ تاکہ وہ اُن کے خیالات سے استفادہ کر سکیں۔ شیخ نے یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اپنی تحریک کے لئے فضا تیار کرنے کی غرض سے نوجوان مصری طبقہ کے خیالات کی تہذیب کرنا شروع کی۔ تاکہ وہ اُس انقلابی مشن کو جامۂ عمل پہنا سکیں جو جمال الدین کے دماغ میں پرورش پا رہا تھا بلنٹ نے اس کے متعلق لکھا ہے:۔

"جمال الدین کی ذہانت و جدّت یہ تھی۔ کہ انہوں نے اسلامی ممالک میں مغربی خیالات رکھنے والوں کی ذہنیت کی اصلاح کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و تلقین کی۔ کہ اسلام کی موجودہ حالت پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی تہذیب کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن و حدیث سے اُن کی وسیع واقفیت نے اُن کو اس کا موقع دیا۔ کہ وہ یہ بتائیں۔ کہ اگر قرآن و حدیث کے صحیح معنی پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ درحقیقت قرآن کے اندر وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے.....

...... اسلام ہر زمانہ میں انسانوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونیکا قائل ہے۔ اور عہدِ جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ علماء کے

تخیل اور ضمیر کو وہ اُن زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ جن میں یہ لوگ صدیوں سے جکڑے پڑے تھے۔ اور بتانا چاہتے تھے۔ کہ اسلام ایک مردہ قالب نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے اندر اتنی لچک ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے۔ .... مصر کی اِس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لیکر ہویدا ہوئیں"[1]

شیخ کی تعلیمات نے ازہر کے نوجوانوں پر بڑا اثر ڈالا۔ اور وہ اُنکے معاونین بن گئے۔ اُن کے جوشِ عمل اور شدتِ ذوق نے چند ہی روز میں مصر کی قومی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ اور شیخ نے عوام کی عروقِ مردہ میں جو تحریک پیدا کی تھی۔ اُسے اور تیز کر دیا۔ مصر میں شیخ نے بہت سی انجمنیں قائم کیں۔ اور اخبار نویسی اور اخبار بینی کا ایک عام شوق پیدا کر دیا۔ شیخ اخبار نویسی کو جمہور میں بیداری پیدا کرنے کے لئے لابدی سمجھتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا۔ کہ کوئی قومی تحریک اُس وقت تک سرسبز نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اُس کے پیچھے پریس کی طاقت نہ ہو۔ اور پوری تندہی کے ساتھ معاشرہ کے ہر فرد کے سامنے صحیح لائحۂ عمل نہ پیش کیا جائے۔ ایک بسیط مضمون میں انہوں نے اِس کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس کا ایک مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

" اما اخبار آں یگانہ صناعت است۔ کہ موضوع آں عموم احوال و اخلاق امم و غایتش اصلاح شئونِ خویش و جلبِ سعادت و رفاہیت

---

[1] :۔ آثارِ جمال الدین۔

وامینت از برائے آں بلکہ از برائے جمیع اُمم مہیا شدہ از آنستکہ جریدہ
مسابقت مینماید در نشرِ فضیلت اربابِ فضائل اولاً از برائے محمدت حقہ
کہ جزائے صاحبِ فضیلت است۔ وثانیاً از برائے حثِ دیگراں برکتساب
فضائل ومبادرت یکند بر ذکر رذائیلیکہ ضررہائے آنہا متعدی است
بجہت کہ صاحب رذیلہ وزجر سائر ناس از ارتکابِ مثلِ آں۔ منافع
اخلاق جمیلہ را بدادلہ واضحہ وبیاناتِ شافیہ بہ نہجے کہ عوام از آں فائدہ
گیرد۔ وخواص نیز بے بہرہ نماند۔ ہر روزہ در اعمدۂ خود دا مینماید۔ و
مسادی صفاتِ خبیثہ دانیہ را ومضرتِ آنہا را در عالمِ انسانی بعبارات
دلپذیر شرح وبسط مے دہد۔ فوائد علوم را از برائے عموم جہاں بیان
مے کند۔ کہ ہر کسے را یقین حاصل مے شود۔ کہ سعادت ہر اُمتے در رفاہیت
وعزتِ آں بعلوم حقہ ومعارفِ حقیقۂ بودہ است۔ نہ بغیر آنہا۔ وخسارت
وزیان جہل را بطورے تقریر مینماید کہ ہر جاہل غبی اعتراف مے کند۔ کہ ہر بلیہ
ومصیبت دگر ندے کہ اورا رسیدہ است ماز شامتِ جہل بودہ است
درجاتِ شرفِ علوم را باندازۂ منافع آنہا در عالمِ انسانی یقین نماید۔
وحقدار لوازم ہر یک را مدلل ومبرہن مے سازد تا آنکہ نادانی بجہت فائدہ
زہیدہ صرفِ عمر گرانبہا نکند۔ واز فائدۂ جلیلہ ایکہ از اشتغالِ بعلمِ دیگر حاصل
یشد۔ محروم گردید۔ وجوبِ ضائع راکہ نتائج علوم است۔ در عالمِ مدنیت
تثبیت وبر عدمِ حصولِ رفاہیت وسعادت بدوں ترقی در صناعات
براہینِ قاطعہ میکند۔ ومعارفِ ضرورہ ایکہ ہر انسان را از برائے صدق

اسم انسان برا و دانستنش واجب و لازم است۔ چہ اولیات جغرافیہ وچہ مبادیٔ طبیعیات وچہ انموذج للکیات وچہ حوادثِ . . . .
وچہ لوازم زراعت وچہ مقتضیاتِ حرف وچہ ضروریاتِ طبیہ وچہ ترتیب منزل وچہ تنظیف بلاد۔ وچہ تربیت اولاد بہ نوعیکہ عوام الناس ازاں بہرہ ور شوند۔ ذکر میکند۔ تجدید انسان و شرحِ حقیقتِ انسان را نمودہ پس ازآں اغنیاء و اربابِ مکنت را بفضیلتِ انسانیت دعوت و بانشائ مکاتب عمومیہ از برائے علوم و معارف وصنائع و بنائے دارالشفاء ترغیب و تشویق مینماید "[1]

برطانوی حکومت نے اسمٰعیل پاشا کو معزول کر دیا۔ اور ۲۶ جون ۱۸۷۹ء کو خدیو توفیق نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ توفیق کی تخت نشینی کے بعد یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو گئی۔ کہ توفیق تخت حاصل کرنے کی فکر میں قوم پرستوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ اُس کا سارا جوش و خروش اور قوم پرستوں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون' اپنی مقصد براری کے لئے تھا۔ چنانچہ جب وہ سریرآرائے حکومت ہوا۔ تو اُس نے سب سے پہلے شیخ کو مصر سے خارج کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انقلاب کا وہ پودا جو شیخ سرزمین مصر میں نصب کرنا چاہتے تھے۔ سرسبز و شاداب ہونے سے پہلے ہی سوکھ جائے۔ لیکن وہ غالباً اِس سے بے خبر تھا۔ کہ شیخ کے خیالات کس حد تک نوجوان مصریوں کے قلوب میں نفوذ کر گئے ہیں۔ اور عام معاشرتی حالات سے ہم آہنگ ہو کر کس قدر جلد یہ بجھی ہوئی آگ بھڑک اُٹھیگی !۔

---

[1]:- شرح حال وآثار سید جمال الدین۔

جب توفیق خدیو بنائے گئے۔ اور فرانس و انگلستان نے مصری حکومت کے اہم شعبوں پر قبضہ کر لیا۔ تو ہر طرف ایک شدید بے چینی پھیل گئی۔ اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا۔ کہ سرکاری محکموں خصوصاً فوج میں سے یورپین عنصر خارج کر دیا جائے فلاحین کے رہنما اور نمائندے اعرابی پاشا تھے۔ جو شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکے تھے۔ انہوں نے ۱۰ ستمبر ۱۸۸۱ء کو قصرِ عابدین کے سامنے ایک زبردست فوجی مظاہرہ کرایا۔ خدیو کو مجبور کر کے شریف پاشا کو وزیرِ اعظم بنوایا۔ فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا۔ اور دارالامراء کا اجلاس منعقد کرانے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۱ جولائی ۱۸۸۲ء کو اسکندریہ پر گولہ باری کی گئی۔ اور اس کے بعد برطانوی فوجوں نے طل الکبیر پر اعرابی کی فوج کو شکست دی۔ اِدھر تو مصر میں یہ شورش برپا تھی۔ اُدھر محمد احمد سوڈانی نے جو ۱۸۷۲ء میں قاہرہ میں شیخ جمال الدین افغانی سے آزادیٔ سوڈان کے مسئلہ پر گفتگو کر چکا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اور جب ۱۸۸۲ء میں برطانوی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں۔ تو مہدی کی فوجوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ۱۸۸۳ء میں جب برطانوی حکومت نے سوڈان کا تصفیہ کرنے کے لئے مصری جنرل عبدالقادر پاشا کو سوڈان سے مصری فوجیں اٹھا لینے کا حکم دیا۔ تو انہوں نے انکار کر دیا۔ خدیو نے جنرل گارڈن کو خرطوم کا گورنر بنا کر بھیجا خرطوم میں گارڈن کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد مہدی کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس کا پیرو دغنہ برابر جہاد کرتا رہا۔ ۱۸۹۶ء میں کچنر خرطوم بھیجا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں دغنہ نے آخری شکست کھائی۔ اور اس کے بعد سے مہدی کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ کہ سوڈان کی آزادی کے متعلق مہدی کی شیخ سے گفتگو ہو چکی تھی۔

مصر میں اعرابی پاشا کی بغاوت اور سوڈان میں مہدی کی شورش ایک ہی تحریک کے دو پہلو ہیں۔ سوڈانی کا مہدی ہونے کا دعوےٰ کرنا بھی ایک گہری حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ اس سے مقصد سوڈانیوں کی ہمدردی حاصل کرنا تھا۔ اور مسلمانوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرکے برطانیہ کی قوت کو جو تمام اسلامی ممالک میں پھیلتی جارہی تھی۔ دھچکہ پہنچانا تھا۔

مصر سے اخراج کے بعد ۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں شیخ لندن پہنچے۔ اور چند ہی روز بعد پیرس چلے گئے۔ اور وہاں اخبارات ورسائل کے ذریعہ اپنے خیالات کی نشر واشاعت میں مصروف ہوگئے۔ شیخ کے پیرس پہنچنے کے بعد شیخ عبدہٗ سعد زاغلول اور مرزا باقر ایرانی بھی جو شیخ کے معاونین میں تھے۔ اُن کے پاس آگئے۔ ۱۸۸۳ء میں شیخ نے ہفتہ وار جریدہ عروۃ الوثقیٰ جاری کیا۔ اس کے اغراض ومقاصد کی تشریح ایک طویل تمہید کے بعد جسے ہم نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ شیخ ہی کے الفاظ میں سنئے۔

"یہ رسالہ بقدر امکان مشرقی قوموں کے لئے اِن ضروری کاموں کو صاف صاف بیان کریگا۔ جن میں کسی طرح بھی کمی کرنا، اُن کی بربادی اور کمزوری اور تباہی کا سبب ہے! اور اُن راستوں کی طرف علانیہ راہنمائی کرے گا۔ جن پر چلنا تلافیٔ مافات کے لئے ازحد ضروری ہے۔ نیز آئندہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی صورتیں پیش کریگا۔ یہ رسالہ مشرق کے اعلیٰ طبقوں کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کریگا۔ اور اُن شبہات اور وہموں کو دور کرے گا۔ جن کی وجہ سے

ہدایت اور کامیابی کا راستہ اُن پر ملتبس ہوگیا ہے۔ اُن کے ان وسوسوں کو رفع کریگا۔ جن کی بنا پر وہ مرض کے علاج و شفا کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں۔ کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اور تدارک اور تلافی کا زمانہ گزر گیا۔ یہ رسالہ سمجھائیگا کہ تمام مشرقی قوموں کے لئے باہمی امداد اور اعانت کا طریقہ بہت ضروری ہے۔ اور یہی اُن کے سیاسی روابط اور وطنی تعلقات کا محافظ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اسی طریقہ کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ آج قومی نے ضعیف کو دبالیا ہے۔ یہ رسالہ اعدار مشرق کی محبت اور خیر خواہی کی اُس منقش چادر کو جو رنگارنگ ملاطفت اور نرم خوئی سے رنگین ہے۔ چاک کرکے جو کچھ پس پردہ ہے۔ اُس کو علانیہ دکھا دیگا۔ اور حریص وطماع مغرب مشرق کی تاریکی غفلت میں آہستہ آہستہ جس مخفی راہ سے چل رہا ہے۔ اُس پر کافی روشنی ڈالیگا۔ یہ رسالہ اس کی خاص کوشش کریگا۔ کہ مشرقی قوموں پر جو غلط الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اور خاص کر مسلمانوں پر جو جھوٹی تہمتیں لگا کر اُن کو بدنام کیا جاتا ہے اُن کی اچھی طرح پردہ دری کرے۔ اور اصلی حقیقت کو سمجھائے۔ نیز بعض ناواقفوں کے اس خیال کی تردید کرے گا۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان کبھی ترقی و تمدن کی برکات سے اُس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ اپنی اصولوں پر کاربند رہیں گے جن پر آج سے سینکڑوں برس پہلے کاربند رہ کر اُن کے اسلاف نے فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ رسالہ تمام مشرقی اقوام کو حوادثِ عامہ سے باخبر کرنے کی ہر وقت کوشش کرے گا۔ اور اُن کے متعلق سیاسی جماعتیں جو طرزِ عمل اختیار کرتی رہیں گی۔ اُن کے انکشافات اور پردہ دری سے غافل نہ ہوگا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ تمام مشرقی قوموں کے باہمی تعلقات کی تقویت اور استحکام اور اُن کے افراد میں باہمی محبت و الفت کی تلقین کی خاص طور پر رعایت رکھے گا۔ اور اُن کے منافع مشترکہ کی تائید و حفاظت کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھے گا۔"

اس اقتباس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ شیخ کے مسلک میں کتنی وسعت تھی۔ اور ان کا نقطۂ نظر کتنا عالمگیر تھا۔ وہ افغانستان میں پیدا ہوئے مگر اُنکا دل مصر، ترکی، ایران اور روس کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی بے چین تھا۔ وہ اپنے آپ کو صرف افغانی سیاست کے اُتار چڑھاؤ تک محصور رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے مصر میں اعرابی پاشا کی بغاوت کی تحریک کی۔ سوڈان میں مہدی کو اُکسایا۔ ترکی میں جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ ترکانِ احرار کی چھوٹی سی جماعت میں جذبۂ قومی کو بیدار کیا۔ رُوس کے مسلمانوں کے لئے زارِ رُوس سے مراعات حاصل کیں۔ ایران میں تمباکو کی کاشت کے اجارہ کے خلاف احتجاج کرکے ایرانیوں کو قومی ہلاکت سے بچایا۔ اُنکے دل میں ایک تڑپ تھی۔ قومی ادبار کی کسک اور خلش اُنہیں ہمیشہ آمادۂ عمل رکھتی تھی۔ اُن کا سینہ وفورِ جذبات سے پُر تھا۔ ہمدردئ نوعِ انسان کا ایک تخیّل تھا۔ جس میں اُنکی روح ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ تمام مشرق کا درد اپنے قلب کی گہرائیوں میں رکھتے تھے اور اُس کی آزادی اور قوت انہیں حد سے زیادہ عزیز تھی۔ ہر بڑے آدمی کا پیام عالمگیر

ہوتا ہے۔جغرافیائی حد بندیاں اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔اسکا تخیل وہ تمام عالم پر حاوی ہو جانا چاہتا ہے۔اُسے تمام اقوام عالم میں ایک روحانی وحدت اور یکسانیت نظر آتی ہے۔وہ نسل اور رنگ کے امتیازات سے بلند ہوتا ہے۔شیخ کی تحریک کا مقصد صرف اتحادِ اسلامی نہ تھا۔بلکہ وہ مشرقی ممالک کو مغربی اقتدار و استحکام کے استیلاء سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔وہ نسل کی بنیاد پر نہیں۔بلکہ ملت کی اساس پر یکجہتی کے قائل تھے۔اور رنگ کے نقطۂ نظر سے نہیں۔بلکہ عالمگیر اخوت کی بنیاد پر اقوامِ مشرق کو ایک لڑی میں منسلک کر دینا چاہتے تھے۔اُن کا اتحادِ اسلامی جارحانہ نہ تھا۔بلکہ دفاعی تھا۔وہ اُس عظیم خطرہ کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔جو مغرب کے پھیلتے ہوئے اقتصادی اور سیاسی استعمار کی صورت میں مشرق کو بے دست و پا کر دینا چاہتا تھا۔وہ جور و ظلم اور حرص و آز کی بجائے حق اور انصاف مساوات اور اخوت کے داعی تھے۔عروۃ الوثقیٰ میں اپنے مقاصد کے متعلق انہوں نے صریح طور سے لکھا تھا۔

"کسی کو یہ خیال نہ قائم کرنا چاہیئے۔کہ یہ جو بار بار خاص طور پر مسلمانوں کا تذکرہ آتا ہے۔تو اس سے مقصود صرف اُنہی کے حقوق کی حفاظت ہے اور اُن کے غیر مسلم ہموطنوں کے حقوق و مصالح کو جو صدیوں سے رشتۂ وطنیت کی بنیاد پر اُن میں باہم مشترک و مخلوط ہیں۔نظر انداز کر دینا ہے۔ایسا کرنا ہماری افتادِ طبیعت اور رجحان کے بالکل خلاف اور ہماری شان سے بالکل بعید ہے۔کیونکہ ایسا کرنے کی اجازت نہ تو ہم کو ہمارے دین نے دی ہے۔اور نہ ہماری شریعت اس کو کسی طرح اور کسی

حال میں جائز رکھتی ہے۔ ہماری غرض عام طور پر مشرقی قوموں کو ہشیار اور بیدار کرنا ہے"۔

شیخ کے سیاسی مضامین جو عروۃ الوثقیٰ میں شائع ہوتے تھے۔ لندن و پیرس کے اکثر اخبارات میں نقل کئے جاتے تھے! اور چونکہ اُن کی تنقید کا لہجہ بہت بے باک ہوتا تھا اس لئے مغربی سیاسیئین میں اُن کی وجہ سے بہت اضطراب پھیل گیا۔ انگریز اسے گوارا نہ کر سکے۔ کہ ایک شخص اُنہی کے دارالسلطنت میں بیٹھکر اُن کے افعال پر حکم لگائے۔ چنانچہ انگریزی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے اکتوبر ۱۸۸۴ء میں عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت بند ہو گئی۔ مرزا لطف اللہ خاں نے اس واقعہ کے متعلق اپنے مبالغہ آمیز طرز میں اس طرح لکھا ہے۔

"جریدۂ عروۃ الوثقیٰ یا نفخۂ صور اسرافیل چناں ولولۂ حس وزلزلۂ حیات و استقلال و قرعۂ سعادت را جادر مردۂ مسلمانانِ دنیا انداخت۔ کہ دول استعماریۂ یورپ عموماً از خوفِ نہضتِ استمرات اسلامیہ متزلزل وارکانِ سیاستاں مضطرب گردید۔ لہذا از تزاید نفوسِ ایں جریدہ بتشویش آفتادند۔ بانواعِ مختلفہ من وجلہ دخولِ آں درتمام متصرفاتِ انگلیس اسباب تعطیلِ آں را انگلیسہا فراہم آوردند۔ و از طرفِ فرانسہ ہم در باطن تائید شدہ۔ تا آنکہ کوکب جریدۂ عروۃ الوثقیٰ در برج ہجدہم غروب نمود"۔ [۱]

---

[۱]:۔ شرح حال و آثار سید جمال الدین مطبوعہ برلن۔

۱۸۸۶ء میں شیخ دوسری مرتبہ روس گئے۔ ۱۸۸۹ء میں جرمنی آئے۔ اور
میونخ میں مقیم رہے۔ جہاں اُن کی ملاقات ناصرالدین شاہ سے ہوئی۔ اُس نے انہیں
ایران آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد شیخ پیرس چلے گئے۔ یہ زمانہ ایرانی رعایا
پر بڑے مصائب کا گزر رہا تھا۔ اور ناصرالدین شاہ کی جابرانہ اوجارحانہ حکومت
ایران پر ایک عذاب الیم کی طرح مسلط تھی۔ ۱۸۸۹ء میں یورپ سے واپسی پر شاہ
نے انگلستان اور روس پر مراعات کے دروازے کھول دیئے۔ اہواز سے ایران
تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ خاص حقوق کے ساتھ ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔
ملک کی معدنیات یورپین ٹھیکہ داروں کے سپرد کر دی گئیں۔ ایک شاہی بنک
قائم کرنے کی اجازت انگریزوں کو دی گئی۔ روسی پرنس ڈوگڈر کو ریلوں کا اجارہ
دیا گیا۔ ایک یورپین کمپنی کو لاٹری قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ جس میں
ملک کی ایک کثیر رقم ضائع ہوئی[1]۔ مراعات کے اسی سلسلہ میں ملک
کی تمباکو کی پیداوار کا ٹھیکہ دیدیا گیا۔ جس نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا۔
قومی دولت پر اجنبیوں کے اس طرح چھا جانے سے مصری قوم مضطرب تو تھی ہی،
تمباکو کے ٹھیکہ نے اُن کے شدید جذبات کے اظہار کے لئے ایک راستہ پیدا کر دیا۔
اور اس سے ایرانی انقلاب کا آغاز ہوا۔

یہ تمام حالات تھے، جب شیخ اپنے وعدہ کے مطابق ایران پہنچے۔ کچھ روز
کے بعد جب اُنہوں نے ناصرالدین شاہ اور امین السلطنۃ کا رخ بدلا ہوا دیکھا۔ تو وہ

---

[1]:۔ آثار جمال الدین افغانی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

درگاہ شاہ عبدالعظیم تشریف لے گئے۔ وہاں مٹھکر انہوں نے اپنی تعلیمات اور مواعظ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور امین السلطنۃ کے خلاف عوام کے جذبات برافروختہ کرتے رہے۔ امین السلطنۃ نے چالاکی سے شیخ کو روس بھیجا۔ تاکہ روس، انگلستان اور ایران کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوئی راہ نکالی جائے۔ اس دوران میں جبکہ شیخ روس میں اپنا کام کر رہے تھے۔ امین السلطنۃ نے شیخ کے خلاف ناصرالدین شاہ کو بدظن کر دیا۔ اور جب شیخ واپس آئے۔ تو نہ صرف ناصرالدین ہی کے تیور بدلے ہوئے پائے۔ بلکہ روس میں بھی اُن کے اثر ونفوذ کو کافی صدمہ پہنچا چنانچہ شاہ عبدالعظیم میں انہوں نے شاہ ایران اور امین السلطنۃ کے خلاف بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ عوام کے دماغوں پر شیخ کی شخصیت اس طرح چھاگئی تھی۔ کہ شاہ عبدالعظیم میں اُن کے گرد ہجوم رہنے لگا۔ اور اُن کے خیالات کی گیرائی نے انقلاب کی تمام قوتیں مہیا کر دیں۔

ایران میں جمال الدین افغانی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے قدامت پرست مجتہدین کو ملّت پروری کا سبق پڑھایا۔ اُن کے منجمد دماغوں میں حرارت پیدا کی۔ خیال اور نظر کے سامنے سے حجابات اُٹھائے۔ دلوں میں تحفظ اسلام اور ناموسِ قومی کا جذبہ بیدار کیا۔ عوام کی خستہ اور بوسیدہ روح کو گرمایا اُن میں جمہوریت اور آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ نوجوانوں کے ذوقِ عمل کی تہذیب کی۔ اور انہیں استبداد کے خلاف ابھارا۔ غرض ایران کے ہر شہری میں

ناصرالدین شاہ کی مطلقیت اور شہنشاہیت کے خلاف ایک عام ہیجان پیدا کردیا۔
۸ مارچ سنہ ۱۸۹۰ء کو ناصرالدین نے تمام ایران میں تمباکو کی کاشت کا اجارہ ایک یورپین کمپنی کو دیدیا۔ سب سے پہلے شاہزادہ ملکم خاں نے جو اس وقت لندن میں ایرانی سفیر تھے۔ اس اجارہ کے خلاف سختی کے ساتھ احتجاج کیا۔ جس کی بنا پر وہ منصب سفارت سے معزول کر دئے گئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ اور ایک اخبار "قانون" کے نام سے جاری کیا۔ جس میں شیخ کے مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ انہی مضامین کا اثر تھا۔ کہ اس واقعہ سے ایران انقلاب کی بنیادیں پڑیں۔

جب ناصرالدین شاہ کے حکم سے شیخ کو شاہ عبدالعظیم میں گرفتار کرلیا گیا۔ اور انہیں طہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر سے کھینچ کر بصرہ پہنچایا گیا۔ تو بصرہ سے شیخ نے حاجی مرزا حسن شیرازی کی خدمت میں وہ معرکۃ الآرا مکتوب لکھا۔ جو بعد میں ضیاء الخافقین" میں شائع کیا گیا۔ اور جس نے عوام سے لیکر امراء تک کی منجمد رگوں میں آگ کے شعلے مشتعل کر دئے۔ اور حمیت قومی کا اس قدر زبردست جذبہ بیدار کر دیا جس نے انقلاب ایران کی حالت بدل دی۔ ہم اس خط کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

میں حق کہتا ہوں۔ یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھ رہا ہوں جہاں کہیں یہ شریعت موجود اور ساری ہے۔ یہ ایک اپیل ہے۔ جو میں ان تمام سچی روحوں سے کرتا ہوں۔ جو اس شریعت پر ایمان رکھتے ہیں! اور اسے نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی میں اپیل کرتا ہوں۔ علمائے اسلام سے اور میں یہ اپیل تمام علمائے اسلام سے کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔

اگرچہ بالخصوص اِس وقت میرا مخاطب اُن میں سے صرف ایک ہے .... خدا نے آپ کو اِس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے۔ تاکہ اُس بڑی روحانی عظمت کی نمائندگی کریں۔ اور خدا نے ملتِ بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے۔ کہ آپ انسانوں کی باگ ہاتھ میں لیکر شریعت اسلامی کے مطابق اُن کی رہنمائی کریں۔ اہلِ ایران اُن سختیوں کی وجہ سے جو وہ برداشت کر رہے ہیں۔ اور اپنے ملک بیت الدین کی حالت کو دیکھ کر جو غیر ملکیوں اور کافروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا گیا ہے اور اُن کے قبضہ میں ہے۔ بہت ناامید ہوگئے ہیں۔ لیکن رہنما کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ پریشان ہیں، منقسم ہیں، معطل ہیں۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں۔ کہ اُن مجتہدوں کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ جنہیں "بہبودئی اسلام کے ہر معاملہ میں اپنا قائد اور رہنما سمجھے اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ تو وہ پریشان ہوتے ہیں۔ اور اُن کا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ کہ تیرا ایک لفظ انھیں متحد کر دیگا۔ اور تیرا ہی حکم فیصلہ کن ہوگا۔ تیرا ہی حرف موثر ہوگا۔ اور کوئی تیرے مرتبہ پر حرف زنی نہ کر سکے گا۔ اگر تو چاہے گا۔ تو اپنے ایک لفظ سے متفرق عناصر کو متحد کر دیگا۔ اِس طرح خدا کے دشمنوں کے دلوں میں خوف پیدا کر کے اہلِ ایران کو اُن کے کینہ سے بچائیگا۔ اُس مصیبت و ابتلار کا خاتمہ کریگا۔ جو انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اور انہیں اُن کی جفاکشی کی زندگی سے نجات دلا کر راحت و آرام عطا کریگا۔ اِس طرح

دین کے پیرو اُس کی حفاظت کریں گے۔ اور اسلام سربلند اور سرافراز ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اے مجتہد اعظم! فی الحقیقت بادشاہ کی قوتِ ارادی کمزور ہے۔ اُسکا کیریکٹر ملیپٹ، اُس کا اندازہ غلط اور اُس کا دل غلیظ ہے۔ وہ حکومت کرنے یا اپنی رعایا کو سدھارنے کا اہل نہیں اور اُس نے تمام بڑے اور چھوٹے معاملات کی انجام دہی میں حکومت کی باگ ایک بدمعاش بے دین، ظالم، غاصب کے ہاتھوں میں سپرد کر دی ہے۔ جو انبیاء کی علانیہ توہین کرتا ہے۔ اور خدائی قانون کی طرف سے لاپرواہ ہے۔ جو اُمرائے شریعت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے۔ اہل زہد و تقوٰے کی تحقیر کرتا ہے۔ معزز سادات کو ذلیل کرتا ہے۔ اور مبلغین کے ساتھ انتہائی حقارت کا سلوک روا رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں فرنگیوں کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ علانیہ شراب خواری کرتا ہے۔ کافروں سے رابطہ رکھتا ہے۔ اور نیک نفس لوگوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ یہ ہے اُس کا چلن۔ اس پر طرّہ یہ کہ اُس نے ہمارے اعداء دین کے ہاتھوں ایرانی سرزمین کا بہت بڑا حصہ مع منافع کے فروخت کر ڈالا ہے (اشارہ ہے معدنیات کے ٹھیکوں کی طرف) یہی نہیں، بلکہ سڑکیں، کاروان سرائیں، باغات، کھیت، سب ہی کچھ اُس نے فروخت کر ڈالے ہیں۔ اسکے علاوہ دریائے کارون اور وہ مہمان خانے جو اُس کے منبع تک اُسکے کناروں پر واقع ہیں۔ اور وہ باغات اور چراگاہیں جو اس سے ملتی ہیں۔

اور اہوازسے طہران تک کی شاہراہ عام اور وہ تمام عمارتیں۔ سرائیں اور میدان جو اس کے گرد واقع ہیں، سب فروخت کرڈالی ہیں یہی نہیں بلکہ تمام ایران میں تمباکو کی کاشت مع زمین وعمارت کے، انگور جن سے شراب بنائی جاتی ہے۔ مع کارخانوں اور سامانِ تجارت کے صابون، موم اور شکر کے کارخانے، غرضیکہ سب کچھ مع متعلقات کے اُس نے کفار کی نذر کر دیا ہے۔ اور آخر میں بنک۔ آپ کیا سمجھیں گے کہ بنک کیا چیز ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی باگ کلیتہً دشمنانِ اسلام کے سپرد کردی ہے............ اس کے بعد نادان دغاباز اپنے کمزور اور بودے دلائل سے لوگوں کو تسکین دینے کے لئے کہتا ہے کہ یہ انتظامات عارضی ہیں۔ اور یہ معاہدے ایک محدود وقفہ کے لئے ہیں۔ جو سو سال سے تجاوز نہ کریگا۔

اے میرے خدا! یہ کیا دلیل ہے؟ جس کی کمزوری پر خائن بھی متعجب ہیں۔ اب جو کچھ باقی رہا۔ وہ اُس نے روس کے سامنے اُس کی خاموشی کی قیمت کے طور پر پیش کر دیا۔ یعنی مُرداب، رشت، دریائے تابرستان، شرک انزلی یا خراسان مع مکانات، سرائے اور متعلقہ کھیتوں کے لیکن روس نے اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی۔ اور اس تحفہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ وہ تو خراسان، آذربائیجان اور ملزندران کا الحاق کرنے پر مائل ہے............ یہ ہے نتیجہ اس پاگل کی حکمتِ عملی کا۔ اور تو اے حامئ اسلام! اگر تو اِن لوگوں کی مدد کے

لئے ٹکڑا نہ ہوگا۔ اور اُن میں اتحاد عمل نہ پیدا کریگا۔ اور انہیں شریعت مطہرہ کی روسے اِن گنہگاروں کے ہاتھوں سے نجات نہ دلائیگا۔ تو فی الحقیقت بہت جلد مملکیت اسلامی غیر ملکیوں کے ہاتھ میں چلی جائیگی جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت کریں گے۔ اور اگر تو نے یہ موقع کھو دیا اے مجتہد! اور یہ واقعہ تیری زندگی ہی میں پیش آگیا۔ بیشک تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑیگا.......... بے شبہ امام وقت نے سنا ہوگا۔ کہ اِن کفر کے سرغنوں نے عالم وفاضل زاہد وعابد حاجی ملا فضل اللہ دربندی کے ساتھ کیا کیا۔ اور اب جلد ہی معلوم ہو جائیگا۔ کہ اِن لوگوں نے اپنے ملک اور دین کے محافظوں کو کس طرح قتل کیا ہے۔ مارا ہے، لوہے سے داغا ہے اور زنجیروں میں جکڑا ہے۔ انہی مظلوموں میں ایک صالح نوجوان مرزا محمدؐ رضا کرمانی ہے۔ جسے۔ اس کافر امین السلطنۃ نے قید خانہ میں زود کوب کیا۔ اور اسی طرح حاجی سیاح محلاتی عالم، مرزا فراغی، مرزا محمدؐ علی خاں اور، اعتماد السلطنت وغیرہ کو بھی اذیت پہنچائی گئی۔ اب میری داستان اور جو کچھ اُس ناشکر گزار ظالم نے میرے ساتھ کیا۔ وہ بھی سن لیجئے۔

اُس مردود نے دارالخلافہ تک برف سے پٹی ہوئی سڑکوں پر اس ذلت اور بے رحمی کے ساتھ جو خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا۔ جبکہ میں خانقاہ شاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا۔ اور بہت بیمار تھا۔ اس کے بعد اُس کے ذلیل خادموں نے باوجود میری علالت کے۔

مجھے ایک باربردار ٹٹو پر سوار کر کے زنجیروں سے جکڑ دیا۔ ایسی صورت میں
جبکہ سردی کا موسم تھا۔ برف کے طوفان آرہے تھے اور تیز سرد ہوائیں
چل رہی تھیں۔ اس طرح سرداروں کی نگرانی میں مجھے خانقین پہنچا یا گیا۔
جہاں پہلے ہی ترکی کے والی سے طے کر لیا گیا تھا۔ کہ مجھے بصرہ بھیج دیا جائے
یہ اس لئے کیا گیا کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ اگر میں آزاد چھوڑ دیا گیا۔ تو میں
سیدھا تیرے پاس آؤنگا، اے امامِ وقت! اور تجھے اُس کے مظالم
سناؤں گا۔ اور اہلِ ایران کے حالات سے آگاہ کر کے تجھ سے مدد کا
خواستگار ہوں گا۔" [1]

اس تاریخی دستاویز کا یہ اثر ہوا۔ کہ ایران کے علماء نے متفقہ طور سے تمباکو کے ٹھیکے کے خلاف فتوےٰ دیدیا۔ جس سے یہ ثابت ہوگیا۔ کہ علماء کا اثر ابھی تک باوجود اتنے تغیرات کے اپنی جگہ بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ ایران کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں ایک موثر قوت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مشرق میں جو روحانیت کا گہوارہ ہے۔ اور تمام مذاہب کا منبع و مخرج رہا ہے۔ عوام کے جذبات کو جب مذہب کی قوت کا سہارا مل جاتا ہے۔ تو وہ پھر اُن کے عمل میں انتہائی شدت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ بڑی سے بڑی استبدادی حکومت سے ٹکر لیتے ہیں۔ مذہب اُن کی پوری زندگی میں اس طرح نفوذ کئے ہوئے ہے۔ کہ جب بھی کسی تار کو چھیڑا جاتا ہے۔ تو ہمیشہ اُس میں سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ مذہبی قرارداں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پیدائش سے لیکر موت تک، ہر سانس اور ہر لمحہ میں وہ مذہب کا نام لیکر ایک ایسا کیف، سکون اور

[1] :- انقلاب ایران۔

اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ جو الفاظ کی محدود وسعت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسی یقین کی بدولت اُن میں زندگی کی کشاکش کے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مذہب کے لئے ہر وقت قربانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور مذہب کی توثیق انہیں بڑی سی بڑی جد وجہد کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ اسی جذبہ کی کارفرمائی دیکھ کر مجبوراً ناصرالدین کو تمباکو کی کاشت کا اجارہ منسوخ کرنا پڑا۔ مگر جو آگ ایک مرتبہ بھڑک اُٹھی تھی۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ سرد نہ ہوسکتی تھی۔ ناصرالدین کو اپنی جان اس کی نظر کرنا پڑی۔

سلطانِ ترکی کی دعوت رد کر کے شیخ بصرہ سے لندن پہنچے۔ تاکہ اُن کی زیادہ قوی کوششوں سے ایران کی اس قومی تحریک کو تازہ خون ملتا رہے۔ اور انقلاب کی وہ چنگاری جو شعلہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ناصرالدین شاہ کے استبدادی طرزِ حکومت کو بھسم کر کے رکھدے۔ لندن میں شیخ نے "ضیاء الخافقین" کے نام سے عربی اور انگریزی میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ مگر چند ہی روز بعد مجبوراً اُس کی اشاعت بند کر دی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں عبدالحمید کے پیہم اصرار پر شیخ لندن سے آخری بار رخصت ہو کر قسطنطنیہ پہنچے۔ اُس وقت دولتِ عثمانیہ زوال و انحطاط کے مدارج بڑی تیزی کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ اور برطانوی سیاست کی کاریگری نے اُس کی رہی سہی حالت کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ عبدالحمید خاں نے دولِ یورپ کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار سے بچنے کے لئے خلافتِ اسلامی کا ایک سیاسی تخیّل دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور اسی تخیّل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے۔ وہ شیخ کے اقتدار اور تدبر سے کام لیکر اپنی حاکمیت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ شیخ اسلامی دنیا کو یورپ کی دستبرد سے بچانے کے لئے اتحاد

اسلامی قائم کرنا چاہے تھے۔ اور ایک ایسا وفاق بنانا چاہتے تھے۔ جو متفرق عناصر کو متحد کردے۔ عبدالحمید اپنی بادشاہت کا بول بالا کرنا چاہتا تھا۔ عبدالحمید اور شیخ کے خیالات میں جو تضاد تھا۔ اُس کا اندازہ اِس سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ پہلا تصور انفرادی شخصی مفاد اور شہنشاہیت کا آفریدہ تھا۔ اور دوسرا اجتماعی، عالمگیر اور انسانیت سے قریب ترطرزِ فکر کی تخلیق تھا۔ عبدالحمید کی نظر تنگ تھی۔ وہ خلافت کا منصب حاصل کرکے یورپ کی نظروں میں اپنا وقار قائم کرنا چاہتا تھا۔ شیخ شیعوں اور سنیوں کے اختلافات دور کرکے اُن میں یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اُن میں اجتماعی قوت پیدا ہوجائے۔ عبدالحمید کے اشارہ پر شیخ نے ایران، مصر اور افغانستان کے ذی عقل اور با اثر لوگوں کو خطوط لکھ کر اس مسئلہ کو اُن کے سامنے پیش کردیا۔ لیکن جب اُنہیں اس بات کا علم ہوا کہ عبدالحمید خاں کا طریق فکر اُس عالمگیر تصور سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جو ایک عرصے شیخ کے دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ تو اُنہوں نے عبدالحمید سے قطع تعلق کرلیا۔ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء میں شیخ نے قسطنطنیہ میں انتقال کیا۔ اِس سے کچھ عرصہ قبل اُنہوں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا۔ جس سے اُن کی حسرت اور افسوس کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:-

"میں یہ خط اپنے پیارے دوست کو لکھ رہا ہوں۔ ایسی حالت میں جبکہ میں زنداں میں اسیر ہوں۔ اپنے دوستوں سے ملنے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ مجھے رہائی کی توقع ہے اور نہ زندگی کی اُمید۔ نہ مجھے اپنی اسیری کا صدمہ ہے اور نہ قتل ہوجانے کا ڈر۔ بلکہ میں اپنی قید اور شرفی موت پر شادماں ہوں۔ کیونکہ میری قید اپنی جنس کی آزادی کے لئے

ہے اور میں بھائیوں کی آزادی کے لئے قتل کیا جاؤں گا۔ مجھے افسوس صرف اس کا ہے کہ جو کچھ میں نے بویا، میں اُسے کاٹ نہ سکا اور اپنے کعبۂ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ باطل کی تلوار نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ کہ میں اہلِ مشرق کی بیداری کو دیکھتا اور نادانی کے ہاتھ نے مجھے اس کا موقع نہ دیا۔ کہ میں اُن کے گلوں سے بانگِ آزادی کو سنتا۔ کاش! میں اپنے خیالات کے تمام بیج انسانوں کی تاثر پذیری کی زمین میں بو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر میں نے اس بارآور اور مفید بیج کو حاکمیت کی اُس شور اور ناکارہ زمین میں ڈال کر ضائع نہ کیا ہوتا۔ اس لئے کہ میں نے اُس زمین میں جو کچھ بویا۔ وہ کبھی نہ اُگ سکا۔ اور میں نے اس شور زمین میں جو کچھ نصب کیا۔ وہ برباد ہو گیا۔ اسی عرصہ میں میرے خیر اندیشانہ مشورے اُن حکمرانِ مشرق کے گوش گزار ہو سکے جن کی خود غرضی اور نادانی نے اُنہیں میرے الفاظ قبول کرنے سے روکا۔ مجھے ایران سے امیدیں تھیں۔ لیکن میری زحمتوں کا بدلہ جلاد کے سپرد کر دیا گیا۔ ہزاروں جھڑکیوں اور وعدوں کے ساتھ انہوں نے مجھے ترکی بلایا۔ اور پھر اس حقیقت کو فراموش کرتے ہوئے کہ پیغامبر کو ہلاک کرنے سے پیغام کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور زمانہ کی لوح پر ہمیشہ حق ہی ثبت رہتا ہے۔ اُنہوں نے مجھے زنجیروں میں جکڑ کر قید کر دیا۔ بہر حال میں اپنے محترم دوست سے یہ خواہش کرتا ہوں۔ کہ وہ میرا یہ آخری خط میرے پیارے ایرانی بھائیوں اور شرکائے کار کو دکھائیں اور اُن تک میرا یہ پیام پہنچا دیں۔" تم جو سرزمین

ایران کا ثمر نورس ہو۔ اور ایرانیوں کی بیداری کے لئے جوش کے ساتھ کمربستہ ہو۔ اسیری اور قتل سے خوف مت کھاؤ۔ ایرانیوں کی نادانی سے پریشان خاطر مت ہو۔ اور سلطان کی جابرانہ حرکتوں سے مت ڈرو۔ پوری تیز رفتاری کے ساتھ کوشش کرو۔ قدرت تمہاری رفیق اور خالق قدرت تمہارا مددگار ہے سیل تجدد تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف رواں ہے استبدادی حکومت کی عمارت گرنے کے لئے لرز رہی ہے۔ انفرادی اجزا اور قوتوں پر ہاتھ ڈالنے اور انہیں تباہ کرنے کی بجائے جہاں تک تم سے بن آئے۔ اس استبداد کی بنیادیں اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرو۔ حتیٰ الوسع اُن رسومات کو برطرف کرنے کی کوشش کرو۔ جو ایرانیوں اور اُن کی فلاح کے درمیان حائل ہیں۔ بجائے اس کے کہ اُن لوگوں کو ہلاک کرو۔ جو اِن رسومات پہ عمل کرتے ہیں۔ اگر تم صرف افراد کی مخالفت کروگے۔ تو تمہارا وقت ضائع ہوگا۔ اگر تم صرف اُن کے مدمقابل ہوگئے۔ تو عاداتِ قبیحہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچیں گی۔ اُن مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرو۔ جو دوسری قوموں سے تمہارے رابطۂ اتحاد میں جارح ہیں[1]

شیخ جمال الدین افغانی کی تحریکِ اتحادِ اسلامی ایک سیاسی تحریک تھی وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک وحدت میں تبدیل کردینا چاہتے تھے۔ تاکہ اُن کی اجتماعی کوششوں میں زور اور اثر پیدا ہو۔ اور وہ متحد و متفق ہو

---

[1]:۔ انقلابِ ایران۔

یورپین قوموں کی بڑھتی ہوئی شہنشاہیت کا توڑ کرسکیں۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی انحطاط پذیر قوت کو جانچ لیا تھا۔ اور اغیار کے منصوبے بھی اُن کی نظر سے مخفی نہ تھے۔ اس لئے انہیں سلامتی اسی میں نظر آتی تھی۔ کہ تمام اسلامی ممالک اپنی قوتوں کو ایک مرکز یعنی ایک خلیفہ کی ذات کے اندر مجتمع کردیں۔ خواہ وہ مرکز ترکی میں ہو یا ایران میں، مصر میں ہو یا افغانستان، روس میں ہو یا شام میں، تونس میں ہو یا الجیریا میں، طرابلس میں ہو یا نجد میں۔ غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ انہوں نے عبدالحمید سے مشورہ کرنے کے بعد مختلف حصصِ عالم میں خطوط روانہ کئے۔ مگر جب انہیں عبدالحمید کی حکمت عملی کا علم ہوا۔ تو وہ اُس سے بیزار ہو گئے! ور اُن کی نفسی کیفیات کا ایک پہلو جو اس خط میں جھلکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسی مایوسی کا نتیجہ ہو۔ جمال الدین کی تحریک کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک مشترک مذہب مشترک تہذیب وتمدن اور مشترک فلسفۂ اجتماعی ہی کے ذریعہ سے مسلمانانِ عالم کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جمال الدین مسلمان سلاطین سے قطعاً ناامید ہو چکے تھے۔ اسی لئے اُنہوں نے عوام اور علماء کو اپنے مشن کی کامیابی کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ جمال الدین چاہتے تھے کہ مسلمانانِ عالم کو یگانگت اور یکجہتی کے سلسلہ میں لاکر اُن کی بنیادوں کو اتنا استوار کردیں۔ کہ پھر کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی اس بند کو نہ توڑ سکے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی صورت نہ دے سکے۔ مگر اُنہوں نے مسلمانوں میں ایک زندہ روح پیدا کردی۔ اور اُن کے اندر ایک بین الاقوامی اخوت کا احساس تازہ کردیا۔ اپنے ایک مقالہ میں جو عروۃالوثقیٰ میں شائع ہوا تھا۔ شیخ نے لکھا تھا۔

"ہر مسلمان اپنے ضمیر سے ایک آواز سنتا اور محسوس کرتا ہے۔ جو اُسے

شریعت کے مطالبہ کو یاد دلاتی ہے، اور فریضۂ ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ وہی آواز ہے۔ جو مسلمان کے دینی الہامات میں سے اُس کے لئے اب تک باقی ہے۔ اور باقی رہے گی۔ مگر اِن سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل اِس مذہب کے پیرؤں میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کی مصیبت سے بے پروا اور بے خبر ہیں۔ مثلاً اہل بلوچستان، اپنی آنکھوں کے سامنے افغانستان کے حالات دیکھتے رہے۔ اُن میں کوئی حرارت اور جوش پیدا نہ ہوا۔ اور اُنہوں نے اپنے افغانی بھائیوں کی مدد کے لئے ذرا بھی حمیت محسوس نہ کی۔ یا دوسری طرف افغانی بلادِ فارس میں غیروں کی مداخلت کا تماشہ دیکھا کئے۔ اور اُن میں بے چینی و اضطراب و ناگواری کا کوئی اثر نہ دیکھا گیا۔ انگریزی فوجوں نے مصر میں آتے جاتے خوب کشت و خون اور قتل و غارت سے کام لیا۔ مگر اُن کی خونریزی کی سیر دیکھنے اور اُن کے حلقوں سے دردناک صدائیں سننے والے بھائیوں میں ذرا عبرت نہ پیدا ہوئی .... بلاشبہ عقلی افکار، دینی عقائد اور تمام معلومات و مدرکات اور نفسی وجدانیات سب تقدیرِ الٰہی سے ظہور میں آتی ہیں۔ اگرچہ یہ اعمال پیدا کراتی ہیں لیکن بعد میں اعمال بھی اُنہیں قوی و پائیدار بنادیتے ہیں..........

بالیقین انسان اپنے افکار و عقائد ہی کی بدولت انسان ہے۔ جو چیز اُس کے آئینہ عقل میں نظر کے مشاہدات اور حواس کے مدرکات سے منعکس ہوتی ہے اس میں نہایت شدید اثر پیدا کرتی ہے۔ اِس صورت

میں ہر مشاہدہ سے ایک خیال اور ہر خیال سے خواہش میں ایک اثر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ہر خواہش سے عمل رونما ہوتا ہے۔ اور عمل سے دوبارہ فکر و خیال کی طرف رجعت ہوتی ہے۔ اس طرح جب تک جسموں میں روحیں باقی رہتی ہیں۔ اعمال و افکار کے درمیان فعل وانفعال کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ عقل کے نزدیک اخوت اور وسائلِ نسب و قرابت کی بھی ایک صورت معین ہے۔ اگر ضرورت و حاجت حصولِ منافع میں رشتہ داروں اور وارثوں کے تعاون پر اور دفع ضرر میں اُن کی اعانت و تقویت پر آمادہ نہ کرتی۔ اور اس معاونت ہر ایک زمانہ گذرنے کے بعد قلبی نسبت ایک ایسا ماخذ اختیار کر سکتی۔ جس سے یہ نسبتِ زندگی بھر برانگیختہ ہوتی رہے۔ اور رشتہ کی مدد اور قلب کی بشاشت سے نفس میں انبساط رونما ہوتا رہے۔ تو جو نکبت و نقصان وجدانیات کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہے۔ قرابتِ رشتہ کو کبھی لاحق نہ ہوتا۔ بلکہ اُس کا معاملہ اتنا شبہ میں ڈال دیتا۔ کہ بعض اہلِ نظر اسے طبعی خیال کرنے لگتے۔ پس اگر صلۂ نسب کو اُس کے علم و استواری کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ اور ضروریاتِ زندگی کسی وقت اس صلہ کے امکان و تائید کی دعوت نہ دیں۔ یا مقصدِ اعانت نسب کے علاوہ کسی دوسری شکل سے حاصل ہو سکے۔ تو اس نسبی رابطہ کا اثر جاتا رہے گا۔ اور عقل میں اس کی صورت صرف روایات و منقولات کے طور پر باقی رہے گی۔ نسبی رابطہ انسانوں کے درمیان قوی ترین رابطہ ہے۔ جو شان اس کی بیان کی گئی، وہی شان اعتقادات کی ہے جسکا

اثر انسانی اجتماع میں ایک دوسرے سے ارتباط ہونے کی وجہ سے
مسلم ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اب وہ پہلی سی جامعیت باقی نہیں۔ صرف دینی عقیدہ ہے۔ جو اپنے لوازم یعنی اعمال سے خالی ہے۔ اور اُن میں باہم تعارف کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور وہ ایک دوسرے سے غیر مستحسن طور پر جدا ہو گئے۔ خود علماء جو عقائد کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت پر قائم ہیں۔ باہم راہ ورسم و مراسلت روا نہیں رکھتے۔ پھر عوام کا کیا ذکر ہے۔ ترکی عالم حجازی عالم کے حال سے نابلد ہے۔ ہندی عالم افغانی سلطنت کے احوال سے ناواقف ہے۔ اسی پر دوسروں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے علماء میں آپس میں رشتۂ ارتباط اور وجہ اتحاد نہیں پائی جاتی۔ اگر کہیں ہے تو اس کی وجہ عام افراد کے خاص وجوہ مثلاً دوستی یا آپس کی قرابت سے مختلف نہیں۔ غرض اُن کی ہیئت کلی یہی نظر آتی ہے۔ کہ نہ اُن میں کوئی وحدت پائی جاتی ہے نہ کوئی مناسبت ان میں سے ہر ایک اپنی طرف نظر رکھتا ہے۔ اور اپنے ہی مقصد کو سراہتا ہے۔ جیسا افتراق و اختلاف علماء میں نظر آتا ہے۔ ویسا ہی مسلمان حاکموں اور بادشاہوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ عثمانی بادشاہوں کی کوئی سفارت مراکش میں موجود نہیں۔ نہ مراکش کی سفارت عثمانیوں کے یہاں قائم ہے۔ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں ہے کہ دولتِ عثمانیہ کے صحیح تعلقات افغانیوں یا مشرق کی اور مسلمان

جماعتوں سے نہیں ہیں۔ ا نہی بے ربطی اور قطع تعلق پیدا کرنے والے امور سے یہ نوبت آگئی ہے۔ کہ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی ایک قوم سے دوسری قوم میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں کوئی علاقہ نہیں رہا ہے۔ تو بالکل صحیح ہوگا۔ صرف ایک تھوڑا سا احساس ابات کا باقی رہ گیا ہے۔ کہ بعض قومیں ہمارے دین پر ہیں۔ اور ہمارے جیسا عقیدہ رکھتی ہیں۔ یا کبھی کبھی حج کے زمانہ میں ایک دوسرے سے اتفاقاً مل لیتے ہیں۔ تو کچھ اُن کے حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔ اس نوع کا احساس بہت تاسف اور ملال کا باعث ہے۔ ایک مسلمان اپنی ملت سے بیگانہ شخص کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا حق ضائع ہوتا دیکھتا ہے۔ مگر اپنے ضعف کی وجہ سے اُس کی مدد کو تیار نہیں ہوتا۔ پہلے ملت اسلام قوی البنیان، صحیح المزاج، زبردست جسم کی طرح تھی۔ پھر اس پر ایسے عوارض نازل ہوگئے۔ کہ اُس کے اجزاء میں پیوند و التیام کی قوت کمزور ہوگئی۔ اور وہ نوبت آگئی۔ کہ ہر جز و الگ الگ ہوکر جسم کی ہیت بھی مضمحل ہوجائے.........."

مرزا سید حسین خاں عدالت اسی سلسلہ میں شیخ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بدبختی و ذلتِ اسلام را از سلاطینِ استبداد و علماء سو میداننت و منفر بود این دو طبقہ دین را بر صلاح خود ساختہ اند و فرسنگہا از اسلام دور افتادہ اند۔ بجائے اینکہ دین را با عقل و منطق مطابقت بدہند عقل و منطق را بخواہند با دینِ ساختۂ خود شاں مطابقت بدہند۔

این است کہ دائماً در جدالند۔ باید بدانند دین را لباسِ علم بپوشانند۔ درمجمع اہلِ علم و تمدن حق حضور ندارند۔ سید مرحوم بخواست اتحادِ اسلام را درروئے قرآن قرار بدہد۔ نہ درروئے احادیث واخبارِ وسلاطین استبدادے رابراندازند۔ پروگرام تحصیل علمائے دین را بمقتضائے وقت وموقع قرار بدہد۔ خرافات وتوہمات راکہ اضافہ بردین شدہ است، ازاذہان فراموش نماید۔ نفاق وکدورتے کہ نسبت باادیانِ دیگر دراسلام ایجاد شدہ متروک بدارد۔ ہرکس حقِ حیات واستقلال در خاکیکہ مالک است، داشتہ باشد۔" [1]

شیخ کی مساعی کا مرکز ومحور یہی تھا۔ کہ اس افتراق کو دور کرکے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں، ایک ایسی وحدت میں پرو دیں جو اغیار کی دست برد سے محفوظ رہنے کی طاقت رکھتی ہو۔ اُن کے حملوں کے خلاف سپر کا کام دے سکے۔ اور اسلام کے ہلالی پرچم کو سرافراز کرسکے! اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوجاتا۔ تو آج نظامِ عالم کی سیاست میں مسلمان ایک حیثیت رکھتے! ور ان کی قوت آج بھی مغربی قوموں کو اسی طرح لرزا دیتی۔ جیسا کہ محمدؐ فاتح کے زمانہ میں لرزا چکی تھی۔ پان اسلامزم کی تحریک سیاست میں گہری نظر رکھنے کا نتیجہ تھی۔ اور اس کے ساتھ مستقبل کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اُن منتشر عناصر کو اس طرح ملا دینا کہ پھر مسلمان اپنے اسلاف کی طرح جہانگیری اور جہانبانی کا حوصلہ کرا کر بالمعروف

---

[1]:۔ شرح حال وآثار سید جمال الدین افغانی مطبوعہ برلن۔

اور نہی عن المنکر کے ضابطوں کو ترویج دیتے۔ اور موجودہ بے چین، مضطرب اور پُرشور دنیا کو مادیت کی گرفت سے آزاد کر کے حکومتِ الٰہیہ سے روشناس کرتے۔ وہ اپنی جگہ آزاد ہوتے۔ اور اس آزادی کا صحیح استعمال کرتے۔ اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک عظیم الشان اسلامی ریاست کی تشکیل کرتے۔ اور اسلام کی زبردست انقلابی تحریک کو موثر عملی اور زندہ قوت ثابت کرتے۔ وہ اسلام کے ابدی اور ہمہ گیر قوانین کا نفاذ کرتے۔ اور دنیا کو خیال اور عمل کے انتشار سے بچا کر صحیح راہِ عمل دکھاتے۔ پھر بھی جمال الدین افغانی کے خیالات کا گہرا اثر پڑا۔ معاہدۂ سعد آباد اور تحریک خلافت کے پیچھے وہی روح کام کر رہی تھی۔ جس میں شیخ کی پوری شخصیت ڈوبی ہوئی تھی۔

"مشاہیر الشرق" کے مصنف نے شیخ کے اصولِ کار اور نصب العین کے متعلق لکھا ہے

"اُن کی زندگی اور کارناموں کے اس مختصر بیان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ نصب العین جس کے حصول پر اُن کی تمام عملی قوتیں مرکوز تھیں۔ اور وہ محور جس کے گرد اُن کی تمام امیدیں گھومتی تھیں اتحادِ اسلام تھا۔ جس کے ذریعہ وہ تمام مسلمانانِ عالم کو ایک اسلامی سلطنت کے تحت اور ایک خلیفۂ اسلام کی حفاظت میں لانا چاہتے تھے۔ اِس کوشش میں انہوں نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ اور اس مقصد کے لئے تمام دنیاوی خواہشات کو ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ نہ شادی کی اور نہ کوئی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے۔ اور اپنے خیالات اور ارادوں کا کوئی تحریری بیان چھوڑے ہوئے انتقال کر گئے۔ سوائے ایک مقالہ کے جو مادّہ پرستوں کے خلاف لکھا

گیا تھا۔ اور مختلف موضوعات پر بہت سے بے ربط خطوط اور پمفلٹ جس میں سے بعض کے متعلق تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ مگر انہوں نے اپنے دوستوں اور بڑوں کے دلوں میں ایک ایسی زندہ روح پھونک دی۔ جس نے اُن کی قوتوں کی تحریک کی۔ اور اُن کے قلم میں تیزی پیدا کر دی۔ اور مشرق اُن کی جد وجہد سے مستفید ہو چکا ہے اور ہوتا رہیگا۔[1]

دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی طرح شیخ کو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے بھی دلچسپی تھی۔ اِس کے ساتھ ہی وہ ہندوؤں سے بھی پوری ہمدردی رکھتے تھے چنانچہ قیامِ حیدرآباد کے زمانہ میں اُنہوں نے رسالہ "معلم" اور "معلم شفیق" میں جس قدر مضامین ہندوستان کے متعلق لکھے۔ اُس میں مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو وہ ہندوؤں کے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کیا کرتے تھے۔ اور اُن کی بہبودی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ ۸ نومبر ۱۸۸۳ء کو البرٹ ہال کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"........ واین جوانان اولادِ ہماں سرزمین ہستند کہ جمیع قوانین وآدابِ عالم از آنجا گرفتہ شدہ است۔ اگر کسے بخوبی ملاحظہ کند خواہد دید کہ کوڈ رومائی مادر ہمہ کوڈہائے فرنگ است۔ او چہار بید دشاستر گرفتہ شدہ است، دورِ افکار او بیدِ دورِ شعرہائے رائق وخیالاتِ عالیہ یونانیہا شاگردِ اینہا بودند۔ یک شاگردِ ایشاں کہ فیثاغورس یعنی "پتاگورس" بودہ است۔ در یونان سببِ نشرِ علوم ومعارف شدہ است۔ حتی بدرجہ

---

[1] :- جرجی زیدان مصنف مشاہیر الشرق۔

کہ قولِ او را کالوحی المنزل من السماء قبول مے نمودند۔ بلا دلیل یہ در افکار فلسفیہ بدرجۂ اعلیٰ رسیدہ بودند۔ خاکِ ہند ہمہ خاک است و ہوا ہوا ہما ہوا۔ وایں جوانانیکہ اینجا حاضر ہستند، ثمرۂ ہماں آب وخاک وہوا ہستند۔ پس من بسیار خوشنود ہستم۔ کہ ایشاں بعد از خوابِ دراز بیدار شدہ ارثِ خود را استرجاع مے نمایند۔ میوہ ہائے خورخت خود را مے چینند۔ ......"[1]

اپنے ایک مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعصب دینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"........... چوں کلام بدینجا رسید، میخواہم بہزار تاسف بگویم کہ مسلمانانِ ہندوستان میں حمایت دینی یعنی تعصب دینی را بسیار بہ نہج بدکار بردہ اند۔ زیراکہ ایشاں تعصبِ را بسبب سوئے استعمال بحدے رسانیدہ اند کہ موجب بغض علوم و معارف و سبب تنفر از صنائع و بدائع گردیدہ است۔ وچناں گمان کردہ اند کہ آنچہ منسوب بمخالفین دیانت بودہ باشد۔ از روئے تعصب دینی آنرا مکروہ و مبغوض داشت اگرچہ علوم و فنون بودہ باشد۔ وحال آنکہ از روئے تعصب دینی بر ایشاں واجب چناں بود کہ ہر جا فضیلتے و کمالے و علمے و معارفتے بہ بینند، خود ہارا احق واول دانستہ در استحصالِ آں سعیہا دکوششہا بکار برند۔ ونگذارند کہ مخالفینِ دیانت حقۂ اسلامیہ در فضیلتے از فضائل و در کمالے از کمالات

---

[1] :- در تعلیم و تعلّم۔

برایشاں سبقت گیرند .... دیگر رسم کہ سوء استعمالِ تعصب دینی مسلمانان ہند بجائے برسد کہ یکبارگی مسلمانان دست از حیات شستہ زندگانی را ترک کنند بجہت آنکہ مخالفین دیانت اسلامیہ دریں عالم زندگانی بکنند .... ۔ [ف ۱]

ایران کے خوشگوار مستقبل کے متعلق، جبکہ ناصرالدین شاہ قتل کر دیا جائیگا۔ اور مظفرالدین شاہ ایرانیوں کو دستور دیں گے۔ شیخ نے بہت لطیف طریقے سے پیشگوئی کی تھی۔

"آفتاب طلوع نمود! ابرہائے تظلم پارہ پارہ گردید۔ غبارہا فرو نشست صورِ دیدہ شد۔ خشمہا فرو نشست ہر کہ از ہر راہ آمدہ است۔ برآں راہ برگشت۔ مالکِ ملکِ خود را التصرف نمود۔ خارہا خشک شد۔ گلہا ریاحین دمیدن گرفت۔ تمام عالم را از ازہار و انوار فرا گرفت۔ چہ بہجت و چہ مسرتے است۔ دیو بدر رود شد۔ شیطان ہلاک گردید۔ عالم در امن و امان است۔ عدل بادشاہ شدہ است۔ ضحاک درکوہ دماوند بسلسلہ درآمد۔ عالم یکبارگی بہشت شد۔ حکم حکم خدا است و بندہ بندہ آں ملک فریاد میکند گوش دہید گوش دہید، بس ازیں مرگ نخواہد بود۔ یہ حیاتِ ابدی زیست نمائید .... ہر نوع در خطیرۂ خود بامن و اماں زیست نماید۔ و ہر طائفہ بحیطۂ خود دلبود و باش کند۔ دستِ تعدی کوتاہ و بازوئے ظلم شکستہ شد۔" [ف ۲]

ف ۱:۔ در تعلیم و تربیت۔

ف ۲:۔ در مکاشفاتِ جمالیہ۔

اپنے ایک مضمون میں شیخ نے اردو کی ترویج و اشاعت، وسعت ذریعہ تعلیم کی اہمیت اردو زبان میں تراجم کی ضرورت اور ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کی نسبت جو باہمی مغائرت دور کرنے میں ممد ہوں گے، اپنے خیالات کا اظہار بہت وضاحت اور وقت نظر کے ساتھ کیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو ہندوستان کے تعلیمی مسائل سے شیخ کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ کی نظر، کس قدر دور رس تھی۔ اور ہندوستان کی قومی زندگی میں کہاں تک گئی تھی۔ یہی وہ مسائل ہیں جو آج پریس اور پلیٹ فارم میں بحث و تحیص کا موضوع ہیں۔ اور ان کے متعلق آج ہندوستان کا سوچنے سمجھنے والا طبقہ بہت عرصہ کے غور و فکر کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ اسے جمال الدین افغانی کی ژرف نگاہی نے آج سے پچاس برس پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس مضمون کے جستہ جستہ حصے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

"............ اکنوں میتوانم کہ ہندوستان را محط نظر خود نمودہ بگویم۔ آنہائیکہ از اہل ہند بر قلہ کوہ نور بصیرت بر آمدہ اند۔ معنی حیثیت را فہمیدہ اند، و مزایائے آں را دانستہ اند، و بدور بین تدبیر درازاں گذشتہ و آئندہ نظر انداختہ اند و بذرہ بین تعمق حالات امم و قبائل ملاحظہ کردہ اند۔ چرا دریں امر سترگ غور نمی کنند۔ آیا نمی دانند کہ بقائے حیثیت و اعتنا شمار آں موقوف بر آنست کہ تعلیم و تعلم در مدارس بلغت وطنیہ بودہ باشد۔ آیا تعجب نمے شود از اینکہ علوم جدیدہ عالم را فرا گرفتہ و فنون بدیعۂ کرۂ زمین را احاطہ نمودہ است۔ و حال آنکہ چیزے از آنہا کہ قابل بودہ باشد۔ بزبان ہندی ترجمہ نشدہ است .... پس چرا استمداد

بگویند از برائے تو سؤ آں لغت بسا ئرلغاتِ متقاربہ بداں چوں سنسکریت و مرہتی و بنگالی۔ و چرا در وقت ضرورت از برائے استکمال آں بلغت انگلیزیہ استعانت مے کنند۔ پس از چہ جہت است کہ دانشمندانِ ہند از ایشاں برائے وطنِ خود ہا را ذخیرہ استحصال نہ نمودہ اند۔

.... پس فخر بر جنس است بہ شرطِ شرافت' وشرافت امینت مگر بہ علوم و معارف و علوم و معارف درآں وقت موجبِ شرفِ جنس مے شود کہ عمومی بودہ باشد و ممکن نیست کہ علوم و معارف عمومی باشد مگر درآں ہنگامیکہ بلغتِ آں جنس بودہ باشد۔ .... واجب چناں است کہ اتفاق نمودہ تعلیم و تعلم مدارس کلیہ وغیر کلیہ خود ہا را بلسان ہندی قرار دہند و ہمہ علوم و معارف را کوشش نمودہ بزبانِ ہندی ترجمہ نمائند تا آنکہ جنسیتِ ہندیت اُستوار شدہ براحت و رفاہیت مدنیت نائل گردند۔"

اِس کے بعد انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"......... بلے حفاظتِ کاملہ و حراستِ تامہ و اطمینانِ خاطرِ کلی و سکونِ قلبِ حقیقی در وقت ایشاں را دستیاب خواہد شد کہ استحکامات پائیداریٔ مملکت خویشتن را در قلوب ہندیاں استوار نمائند۔ ایں بدیں گونہ مے شود کہ لغتِ ہندیہ را نیز دولتِ رسمیۂ خود قرار دادہ در جمیع جلسات متعلقہ بامورِ ہندوستان استعمال کنند۔ ....

وامتیازِ غالبیت را برداشتہ ہندیاں را در جمیع حقوق حتیٰ در مجلس (پارلیمان)

باخود شریک سازند۔ چونکہ امتدادِ مدتِ اجنبی بودن بقدرِ امتدادِ زمان وصعت غالبیت است............ ودیگر آنکہ اعانت نمایند در ترجمہ علوم وفنون......... از لغتِ انگلیزیہ بزبانِ ہندی، واز برائے اجراءِ این عمل جمعیتی تشکیل نمائند............ فنونِ جدیدہ را در مدارس ومکاتبِ طالبانِ وطن تعلیم دہند۔"[۵]

اپنے ایک اور مضمون میں جمال الدین نے مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اسلامی سلطنتوں کی کمزوریوں اور خامیوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے اور پھر اس انتشار وبے ترتیبی، اضمحلال اور انحطاط کا علاج بھی بتایا ہے۔

"این چہ حالت است، این چہ فلاکت است، مصر وسوڈان وشبہ جزیرۂ بزرگ ہندوستان راکہ قسمت بزرگے از ممالکِ اسلامی است انگلستان تصرف کردہ مراکش وتونس والجزائر را فرانسہ تصاحب نمودہ جاوہ وجزائرِ بحرِ محیط را ملک الرقاب گشتہ، ترکستانِ غربی وبلاد وسیعۂ ماوراالنہر وقفقاز وداغستان را روس بحیطۂ تسخیر آوردہ، ترکستانِ شرقی را چین متصرف شدہ واز ممالکِ اسلامی جز معدودے برحالتِ استقلال نماندہ، اینہا نیز درخوف وخطرِ عظیم اند۔ شب را از ترسِ اردپایان خواب ندارند۔ وروز را از وحشت ودہشتِ مغربیان آرام نیستند۔ نفوذ اجانب چنان۔ رعب وقت اں سرایت کردہ کہ از شنیدن نام روس وانگلیس

۵: ۔ در فلسفۂ وحدتِ جنسیت وحقیقت اتحادِ لغت ۔

برخود میلرزند۔ واز ہولِ کلہ فرانسہ وآلسماں مدہوش مے شوند۔ ایں ہماں ملّت است کہ از پادشاہانِ بزرگ جز یہ میگرفتند وامراء عالم باکمال عجز وانکسار بدستِ خود باج بدیشاں میدادند۔ امروز کارِ شاں بجائے رسیدہ کہ در بقارء حیاتِ شاں اہلِ عالم مایوسند۔ ودر خانۂ خود زیر دست وتوسری خودرا اجانب اند۔ ہر ساعت بحیلۂ بیچارگاں را بتر ساند۔ وہر دم نیرنگی روزگار ایشاں را سیاہ ومال شاں را تباہ سازند۔ نہ پائے گریز دارند ونہ دستِ ستیز۔ پادشاہانِ شاں بملوکِ دیگر فردتنی آغاز ند۔ تا اگر چہار حاجی زندگی کردن بتوانند۔ ملّتِ شاں پناہ بخانۂ ایں وآں برند۔ شاید اندکے راحت شوند۔ آہ اہ! ایں فاجعۂ عظیمے است۔ ایں چہ بلائے است نازل گشتہ۔ ایں چہ حانے است پیدا شدہ۔ کوآں عزت درفوت؟ چہ شد آئی جبروت وعظمت؟ کجا رفت آں حشمت واجلال؟ ایں تنزل بے اندازہ راعلتِ چیست؟ ایں مسکنت وبیچارگی را سبب کدام است؟ آیا تیواں در وعدۂ الہٰی شک نمود؟ معاذ اللہ۔ آیا تیواں از رحمتِ خدا مایوس شد؟ نستجیر باللہ۔ سبب را از کجا پیدا کنیم؟ علت را از کجا تفحص کردہ واز کہ جویا شویم؟ جز اینکہ بگویم ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔[لہ]

جمال الدین افغانی کی شخصیت مشرق اور مغرب کی تاریخ میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس شخصیت کے بعض پہلو آپ کو ان سطور میں نظر آ سکتے ہیں۔ جن میں اُنکے

لہ:۔ چرا اسلام ضعیف شد۔

مختلف کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِس کو ذہن میں رکھ کر ہر شخص اپنی قوت متخیلہ کے مطابق جمال الدین کی تصویر بنا سکتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک اپنی رنگارنگی کے باوجود اساسی اعتبار سے یکساں ہوگی۔ یعنی اُن کے کردار کے وہ نقوش جو سب سے زیادہ روشن اور جاذب نظر ہیں۔ اُن میں مشترک ہوں گے۔ جمال الدین کا دل پارہ کے مانند بے چین تھا۔ اُن کی قوتِ عمل ہمیشہ اپنے مظاہرہ کے لئے ایک میدان مانگتی تھی۔ اُن کی زبان سے دمِ تقریر شعلے نکلتے تھے۔ اُن کی تحریر کے جوش اور بے پناہ قوت میں نٹشے کے طرز کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ مختلف علوم اور زبانوں کے ماہر تھے۔ مگر اُن کی علمی استعداد کو سیاسی فراست اور بصیرت نے چھپا لیا تھا۔ طبیعت میں بلا کا عزم اور استقلال تھا۔ ناکامیوں سے ہمیشہ اُن کے جذبۂ عمل کو تازہ خون ملتا تھا۔ اُن کا لہجہ تند و تیز تھا۔ تنقید کی کاٹ مشکل سے ہو سکتی تھی۔ وہ کسی کے اقتدار سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ اُن کا دل ایک مسلمان کی طرح صاف اور بے خطر تھا۔ وہ بے عملی اور جمود کو زندگی کی اُبھرنے والی قوتوں کے خلاف ایک روک سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگی ہمیشہ بڑی بڑی مہمات کے سر کرنے میں گزری۔ اور اِس سے جو تجربہ حاصل ہوا۔ اُس نے اُن کے مطالعہ اور مشاہدہ کو نکھار کر نظر میں گہرائی، عزائم میں بلندی اور اعتقادات میں قوت پیدا کر دی! اُنکا اندازہ اتنا صحیح اور حکمتِ عملی اتنی موثر ہوتی تھی کہ نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔

وہ اپنے نصب العین میں سچائی کے ساتھ یقین رکھتے تھے! ور اُسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر ہمیشہ بلندی اور رفعت کی طرف جاتی تھی۔ منزل کی دوری اُن کی آس کو کم نہ کرتی تھی۔ رکاوٹوں سے وہ پریشان خاطر نہ ہوتے تھے ذاتی نقصان

سے انکی لگن نہ بجھتی تھی۔ نام و نمود سے انہیں سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت میں بہت بے باک تھے اور اکثر حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ اس لئے اُن کی راہ زیادہ پُر خطر بنی تھی۔ وہ کوئی چالاک مدبر نہ تھے۔ جو عیاری سے کام نکالتے۔ وہ ایک سچے اور پکے مجاہد تھے، بات کے کھرے، دھن کے پورے، وہ راست گفتاری اور قوت کے ساتھ اپنا مقصد ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ وہ ایک جری سپاہی تھے۔ بے پرواہ، مستقل اور اٹل۔ انکی سیاسی سمجھ بوجھ کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ انہوں نے مشرقی اور مغربی ممالک کی سیاست کو پرکھ کر دنیا کے ہر گوشہ سے اسلامی سیاست کو فروغ دینے کے لئے کام کیا۔ اور بعض ملکوں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ جہاں گئے انہوں نے اپنی فصاحت و بلاغت اور ہمدردی سے دلوں میں نفوذ کر لیا۔ اور پھر اپنی دانشمندانہ حکمتِ عملی سے کام لیکر اپنے قومی مشن کیلئے فضا ہموار کر لی۔ پروفیسر براؤن انکے متعلق لکھتے ہیں۔

"وہ ایک غیر معمولی سیرت، وسیع علمیت، ان تھک سرگرمی، بے باک جرأت، تحریر و تقریر میں بے انتہا فصاحت، و رشاندار، جاذب توجہ شکل و صورت کے مالک تھے وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، مقرر اور اخبار نویس تھے۔ اور ان سب سے بڑھکر سیاستداں۔ انکے مداح انہیں ایک بڑا محب وطن سمجھتے تھے۔ اور انکے مخالفین ایک خطرناک محرک" [1]

نوٹ:- اس مقالہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	خالدہ ادیب خانم	مطبوعہ جامعہ
۲۔ آثارِ جمال الدین افغانی	قاضی عبدالغفار خاں	مطبوعہ انجمن ترقی اردو (دہلی)
۳۔ مقالاتِ جمالیہ	جمال الدین افغانی	
۴۔ شرح حال و آثار سید جمال الدین	مرزا لطف اللہ خاں۔	مطبوعہ برلن۔
۵۔ انقلاب ایران۔	پروفیسر براؤن	

---

[1]:- انقلاب ایران۔

قطعہ تاریخ

(از جناب شجاع احمد خاں صاحب زیبا)

مجلسِ آفتاب کے صدرِ یگانہ روزگار
تیز نظر، دقیقہ رس، نکتہ شناس و دوربیں

خدمتِ دیں کے جوش میں محنتِ روز و شب کے بعد
کردئے شائع آخرش، چند نقوشِ دلنشیں

پڑھ کے فسانۂ کہن پھر گیا ایک بار پھر
چشمِ تصورات میں نقشِ قرونِ اولیں

روح تڑپ تڑپ گئی، جوشِ جہاد جاگ اُٹھا
ہر رگ و پے میں موج زن ہو گیا خونِ آتشیں

چنگ و رباب توڑ کر تیغ و تبر اُٹھا لیے
آگئی دل میں تازگی، ہو گیا پختہ تر یقین

کام یہ شاندار ہے، آپ کی یادگار ہے
خم ہے بطورِ اعتراف اہلِ نگاہ کی جبیں

کردۂ فتحِ مشکلات، عمر ترا دراز باد
کارِ رفیع می کند، مردِ اریب ہمچنیں

اشہبِ خامہ تیز شد، زیبا چوں من بخواستم
سال شمار کردن از ہجرتِ ختمِ مرسلیں

ملہمِ غیب نے کہا سالِ طباعتِ کتاب
صفحۂ دل پہ چھپ گیا، ذکرِ مجدّد دین دیں

سنہ ۱۳۶۰ھ

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

سالانہ روئداد آفتاب مجلس

(بابت ۴۱-۱۹۴۰ء)

(از معتمد اعزازی، بہ تصدیق جناب صدر)

کیفیت | آفتاب مجلس ہی آفتاب ہال کی وہ واحد جماعت ہے، جو یہاں کے طلبار کے خیالات اور احساسات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ یہ مجلس محض عکسِ رُخ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ ہمارے میلانات کا مظہر بھی ہے اور اُن پر اثرانداز بھی ہوتی ہے، یہ ہمارے ذوق کا آئینہ بھی ہے اور اُسے جلا بھی دیتی ہے۔ یہ ہماری یگانگت کا اک نشان بھی ہے اور ہم میں اتحاد پیدا بھی کرتی ہے۔ غرضیکہ اسے آفتاب ہال کی زندگی میں، ہر طرح، مرکزی شان حاصل ہے۔

مقصد | اس مجلس کا مقصد محض تحریر و تقریر کی قوتوں کی نشو و نما ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے، ایک خاص سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے، طلبار کی تربیت کا مسئلہ بھی ہے۔ ان ذمہ داریوں کو قبول کرنا، گویا زندگی کے ہر شعبہ میں طلبار کی رہنمائی کرتا ہے۔

ہمارے پیشرو اور ہم | ہمارے پیش رووں نے، حتی المقدور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ اُن کے سامنے کافی بلند مقاصد تھے، لیکن دیگر ضروری تفصیلات نے اُنہیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنے تعمیری پروگرام پر پورا عمل کر سکیں۔ مباحثے منعقد کئے گئے۔ تحریری انعامی مقابلے ہوئے اور انہوں نے اپنے

طور پر خدمت کی۔ لیکن چند روز یا چند لمحوں کی گرمی اور جوش سے کوئی مجلس زندہ نہیں رکھی جا سکتی۔ سابق صدر، جناب محب اللہ صاحب ندوی نے کافی کام کیا۔ اور بعد کو، اُس کی ذمہ داریاں ہمارے دوش پر ڈال دی گئیں۔ ہر شخص جسے مجلس سے دور کا تعلق بھی ہے، اسے تسلیم کرے گا کہ ہم نے اُس میں نئے سر سے جان ڈالنے کی کوشش کی، اُسے نئی بنیادوں پر اُٹھانے اور بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ ہم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں کہا جا سکتا ہے اور بلا خوفِ تردید، کہ اب تک ایک سال میں اتنا شاندار اور تعمیری اور اہم کام، آفتاب مجلس کی طرف سے نہیں ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ غفلت اور افسردگی، جو کچھ عرصہ سے پیدا ہو چلی تھی ختم ہو گئی ہے اور وہ بے ربطی اور انتشار، جو فضا پر چھا گیا تھا، اب چھٹ چلا ہے۔ ہماری کابینہ ہمیشہ اس امر کی کوشاں رہی کہ مجلس کی سرگرمیوں کو بلند سے بلند تر اور وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ تاکہ طلباء میں سماجی بیداری پیدا ہو، یہی وہ اعلیٰ نصب العین تھا، جس کے واسطے ہم نے سال بھر، خلوص نیت سے کام کیا ہے۔

کام کا خاکہ | (۱) ہال کے طلباء میں ربط و ضبط بڑھانے کے لئے ایک "انٹر ہوسٹل ڈبیٹ" منعقد کیا گیا۔ یہ ڈبیٹ تاریخی حیثیت سے اہم اور اپنی نوعیت کا پہلا کارنامہ ہے۔ ہم نے اسے ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے، ایک ٹرافی، رئیس الاحرار، شہید ملت حضرت مولانا محمد علی جوہرؔ کے نام نامی پر رکھی۔ مولانا محمد علیؒ نے ملک و ملت اور خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے لئے جن خدمات اور قربانیوں کا نمونہ پیش کیا ہے وہ ہمارے لئے افتخار کی پونجی ہے۔ وہ شخصیت استقلال کی ایک ہی مثال تھی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ

ہمارے لئے آج بھی زندہ اور متحرک ہے، آفتاب مجلس نے اپنی بساط کے مطابق ایک حقیر ہدیہ، اُس زعیم ملت کی یادگار کے طور پر "جوہر زینگ ٹرافی" کی صورت میں پیش کیا ہے، یہ ٹرافی اپنی حیثیت، خوبصورتی اور ڈیزائن کے اعتبار سے شمالی ہندوستان کی بہترین ٹرافیوں میں سے ہے۔

(۲) انعامی مقابلے | مجلس کے تعمیری پروگرام کے سلسلے میں ایک تحریری انعامی مقابلہ فروری سنہ ۴۲ء میں کیا گیا تھا اور دوسرا تحریری انعامی مقابلہ نومبر سنہ ۴۱ء میں اس کے علاوہ کئی انعامی مباحثے بھی منعقد کئے گئے جو بہت ہی کامیاب رہے۔ ان میں خاص خیال اس امر کا رہا کہ اسلامی مباحث اور مسلم لیگ کی سیاست کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے تاکہ طلبار کے خیالات اور احساسات مطالعہ، یقین اور تحقیق پر قائم ہوں۔ "پاکستان، اسلامی ریاست اور قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی مختصر زندگی" اُن میں سے چند عنوانات ہیں۔

(۳) انعام پانے والے حضرات کو تقریباً ڈیڑھ سو روپئے کی کتابیں بطور انعام تقسیم کی گئیں۔ آج کل ہر شخص اپنی جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یونیورسٹی میں اچھے بولنے والے زیادہ نہیں پیدا ہوتے، ہال کی مجلسوں پر اس سلسلے میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں پوری تندہی سے منظم کرنا چاہئیے اور اس امر کی کوشش ہم پر فرض ہے کہ وہاں زیادہ سے زیادہ تحریری اور تقریری مجلسیں منعقد کی جائیں، تاکہ طلبار کی ہمت افزائی ہو اور وہ آگے بڑھیں۔

(۴) دارالمطالعہ | مجلس کا دارالمطالعہ اس سے پہلے اچھی حالت میں نہ تھا۔ اُس میں دکن ٹائمز اور چند اخبار اور رسالے آتے تھے۔ شروع میں ہم نے کوشش کی کہ کسی طرح

کامن روم کو آفتاب مجلس کے ماتحت کر دیا جائے تاکہ دارالمطالعہ کو عظیم الشان پیمانے پر چلایا جاسکے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اور بعد میں، بجٹ کی تنگ دامنی نے ہمارے منصوبوں کا ساتھ نہ دیا۔ تاہم، ہماری کوششوں سے سال بھر اُردو زبان کے تقریباً تمام معتدر اور بہترین سیاسی، مذہبی اور ادبی رسائل آتے رہے ہیں مثلاً معارف، سیاست، بُرہان جامعہ، طلوع اسلام، ترجمان القرآن، ہمایوں، سائنس ہماری زبان اُردو........ نیز ادکن ٹائمز ماڈرن ریویو اور انڈین القار میشن وغیرہ.......... ارادہ ہے کہ ان رسائل کو مجلد کرا کے آفتاب ہال کامن روم کی لائبریری کو بطور عطیہ دے دیا جائے تاکہ طلباء زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔

(۵) اُردو زبان | (۱)، ہماری مجلس کے ماتحت، اس کی زندگی میں پہلا مشاعرہ ہوا۔ جناب آلِ احمد صاحب سرور نے صدارت فرمائی۔ باہر کے مشہور شعراء (حضرتِ جگر، حضرتِ وانش) اور دوسرے بزرگوں نے شرکت فرمائی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی ہماری بہت سی نیک اور حسین بدعتوں میں سے ایک نیک اور حسین بدعت تھی ــــــ

(ب) اس بات کے ثبوت کے لئے کہ اُردو زبان، مشرق سے لیکر مغربی ہند تک کشمیر سے لے کر دکن تک، محلوں سے لے کر جھونپڑیوں تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس میں وسعت ہے اور ہمہ گیری ــــــ ہم نے آفتاب مجلس کی جانب سے دیہاتی گیتوں کے جمع کرنے کا اعلان کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ لیکن توقع سے کم۔

(۶) سب سے عظیم الشان اور قابل قدر کارنامہ

لیکن ہمارا سب سے شاندار کارنامہ جو طلبائے آفتاب ہال ہی کے لئے نہیں، پوری یونیورسٹی کے لئے قابلِ فخر ہے۔ ہماری وہ کتاب ہے، جو احیاءِ اسلام کی تحریک اور ادب میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ آفتاب مجلس نے جو ذہنی اصلاح کے لئے کام کیا ہے وہ اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ یہ کتاب، ہماری بڑی شخصیتوں کی مصوّر ہو اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سی تفسیر۔ لیکن افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک طرف مختلف موضوعات پر اچھے مضامین نہ مل سکے اور دوسری طرف ہمیں زیادہ وقت نہ مل سکا۔ اس کتاب کا کام جنوری ۱۹۴۲ء سے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں ہم نے جنگ کے اثرات کو بھی کافی محسوس کیا، ورنہ 'یوں تو غلامی میں بڑا امن ہے۔ بجٹ کی قلت کے سبب صرف پانچ سو جلدیں طبع کرائی جاسکیں۔ مضامین کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ وہ قوتِ فکر کو ابھارنے اور مذہبی جذبہ بیدار کرنے میں مدد کریں۔ اور یہ ثابت ہو جائے کہ اسلام شکست خوردہ ذہنیت نہیں، ایک زندہ قوت ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا سہرا دراصل جناب **خورشید الاسلام** صاحب کے سر ہے۔ یہ انہی کی تندہی، فرض شناسی اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب "اسلام اور اسلامی مفکرین" ناظرین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

ہمارے پروگرام کو کامیاب بنانے میں کابینہ کے اراکین نے جس دلچسپی سے کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ ہم اپنے صدر اعلیٰ جناب **غلام سرور** صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری ہر قدم پر مدد کی۔ اُن کی استادانہ شفقت کے

بغیر ہم اپنے کام میں اس قدر کامیاب نہ ہو سکتے تھے، اس کتاب کی جملہ خامیوں کا ہمیں اعتراف ہے۔ امید ہے کہ ہماری مصروفیت اور کاتبوں کی مہربانی اور دوسری وجوہات کے پیشِ نظر، ہماری معذرتِ قابلِ قبول سمجھی جائے گی۔

معتمد اعزازی
ملک حامد حسین

(نومبر ۱۹۴۱ء)

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

میں طبع ہوا ۔ ۱۳۶۲